ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

مارچ ۲۰۲۵ء

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اترپردیش

۱۵/روپے

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ لوک بھون میں منعقد نابارڈ اسٹیٹ کریڈٹ نمائش میں لوگوں کو توصیفی اسناد دیتے ہوئے۔

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ لوک بھون میں منعقد نابارڈ اسٹیٹ کریڈٹ نمائش کا معائنہ کرتے ہوئے۔

جلد:79 شمارہ:11

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

مارچ ۲۰۲۵ء

سرپرست

جناب سنجے پرساد

پرنسپل سکریٹری، محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

پبلشر: جناب وشال سنگھ (ڈائرکٹر، انفارمیشن)

جناب اروند کمار مشر (ایڈیشنل ڈائرکٹر، انفارمیشن)

ایڈیٹر

آسیہ خاتون

7705800986

Email:nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ:

صبا عرفی:7705800953

تزئین کار: ایم. ایچ. ندوی

مطبوعہ: پرکاش پکچرس، گولہ گنج، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

زرِ سالانہ: ۱۸۰/روپئے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پنڈت دین دیال اُپادھیائے سوچنا پریسر، پارک روڈ،

اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Pleas send Cheque/Bank Draft in favour of Director,Information & Public Relation Department,Pandit Deendayal Upadhyay Soochna Parisar,UP,Lucknow

خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

اس شمارے میں...

اداریہ — اپنی بات ۲

مضامین

عصمت چغتائی کی خاکہ نگاری	پروفیسر ڈاکٹر توقیر عالم	۳
شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری	ڈاکٹر گل جبین اختر	۶
ایک تحقیقی محاسبہ: احمد معمار اور امام الدین ریاضی	ڈاکٹر علی اکبر شاہ	۱۳
شمس النساء بیگم کا دیوان	محمد شاہد ساز	۱۶

منظومات

غزل	ثقلین مشتاق	۱۲
غزلیں	احمد کمال حشمی / ڈاکٹر رضوان الرضا، رضوان	۱۹
غزلیں	شازیہ نیازی / سید اسلم صدآمری	۲۰
غزل	ڈاکٹر قدسیہ انجم علیگ	۲۸

افسانہ

'خدا گواہ رہے گا'	رینو بہل	۲۱
ماہ کامل	ملکیت سنگھ مچھانہ	۲۶

افسانچہ

ایک کپ کافی	آسیہ خاتون	۲۹
سکتا رشتہ	رئیس صدیقی	۳۰

تبصرہ

بارش کے پھول	شاعر: کاظم جرولی مبصر: شبیہ عباس	۳۱

ترقیات

اتر پردیش میں سردی سے تحفظ: شیلٹر ہوم زاور حکومتی اقدامات	شاہد عباس	۳۲

ماہنامہ نیا دور، information.up.nic.in ویب سائیٹ پر دستیاب ہے۔

قیمت فی شمارہ: پندرہ روپئے — سالانہ رکنیت فیس: ایک سو اسّی روپئے

دو سال کی رکنیت فیس: تین سو ساٹھ روپئے

تین سال کی رکنیت فیس: پانچ سو چالیس روپئے

نوٹ: اپنی کمپوز شدہ تخلیقات، مندرج ای: میل آئی ڈی پر ہی ارسال کریں۔

E:mail:nayadaurmonthly@gmail.com

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اپنی بات

مارچ ۲۰۲۵ء کا شمارہ قارئین کرام کی خدمت میں حاضر ہے۔

کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفیؔ اردو ہماری ہے

''ماہنامہ نیا دور'' کی یہ تازہ اشاعت میری ادارت میں اپنے ساتویں مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سلسلہ اپنے تواتر کے ساتھ جاری رہے گا، چونکہ ابتدا میں حائل ہونے والی بہت سی دشواریاں جو ایک مسئلہ کی صورت اختیار کر رہی تھیں اب وہ گرفت میں آچکی ہیں، جس کی وَاگزاری کا عمل بھی تیزی سے جاری ہے۔ مجھے اس بات کا علم ہے کہ ''ماہنامہ نیا دور'' سے متعلق اہل قلم و ریسرچ اسکالرس کے مضامین موصول تو ہو رہے ہیں لیکن اُن کی اشاعت میں تقدم و تاخر کے مسائل حارج ہیں۔ معروضات نقد و تخلیق کی بروقت اشاعت نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کی شکایتیں درست ہیں۔ لیکن یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اِن پیش پا اُفتادہ شماروں کی زمانی صف بندی کی ارتجالی صورت میں اس طرح کے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ فی الحال ہماری پہلی کوشش یہی ہے کہ یہ تاخر شدہ شمارے کسی صورت شائع ہو جائیں۔

''ماہنامہ نیا دور'' کے اداریوں میں خاص کر ان اضافی گفتگو کو معرض تحریر میں لانے کی کوشش کرتی ہوں تا کہ آپ اُن دشواریوں سے واقف رہیں جو شماروں کی شائع ہونے میں پیش آتی ہیں۔ حالانکہ میں نے اپنے تحریری معروضات کے لیے ایک بہترین شعر کے انتہائی خوبصورت مصرعہ کا انتخاب کیا ہے۔ جو ایک مصرعہ ہونے کے باوجود اپنی معنوی جامعیت کے مکمل بیانیہ کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اس مصرعہ میں ایک ایسے نفسیاتی خوف کا اظہار ہے، جو اردو زبان کے مستقبل سے تعلق رکھتا ہے۔ چونکہ اردو زبان و ادب کے حوالے سے موجودہ عہد میں جو رویہ اختیار کیا جا رہا ہے وہ کسی بھی صورت مناسب نہیں۔ اردو زبان سے متعلق پیدا ہونے والے ہر طرح کے اندیشوں کا تدارک اور اس کے فروغ کے لئے ایک منصوبہ بند تحریک کی سخت ضرورت ہے۔ اس کام کے لئے کچھ قلندر مزاج لوگوں کی ضرورت ہے، ورنہ اردو کے نام پر ہونے والی دھندے بازیاں اس زبان کی تباہ کاری کے لئے کافی ہے۔ اردو زبان کے بدن پر رسنے والا یہ زخم آج کا نہیں بہت پرانا ہے۔ جس کی مرہم پٹی کا کام ہر عہد میں بحسب ضرورت کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن اس کی شفایابی کی ابھی تک کوئی مکمل تدبیر ہاتھ نہیں آئی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اردو والے ابھی اتنے سخی نہیں کہ کسی شخص کی بے لوث ادبی و لسانی چھوٹی سی چھوٹی یا بڑی سے بڑی خدمت کو اپنی مثبت سوچ سے ہم آہنگ کر کے اس میں ستائش کا پہلو تلاش کریں۔ لیکن اس کے برعکس ہم داغ دہلوی کے اس شعر کی دعوے داری ضرور کرتے نظر آتے ہیں۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

مجھے امید ہے کہ ماہنامہ نیا دور کے قارئین بھی کتابوں سے عشق کرنے والے ہر اول میں اپنا نام مقدمۃ الجیش میں درج کرائیں گے۔ شکریہ

آسیہ خاتون

یہ شمارہ مارچ ۲۰۲۵ء کا ہے جس کو اپریل ۲۰۲۶ء میں شائع کیا جا رہا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر توقیر عالم

سابق پرو وائس چانسلر، مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی، پٹنہ

9934688876

عصمت چغتائی کی خاکہ نگاری

خاکہ نثری ادب کی ایک دلکش صنف ہے۔ اس کا آرٹ غزل اور افسانے کے آرٹ سے مشابہت رکھتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ افسانہ اور غزل کی طرح یہاں بھی اشارے اور کنائے سے کام لیا جاتا ہے کیونکہ اختصار اس کی بنیادی شرط ہے۔ خاکے میں کسی شخصیت کے نقوش اس طرح ابھارے جاتے ہیں کہ اس کی خوبیاں اور خامیاں اجاگر ہو جاتی ہیں اور ایک جیتی جاگتی تصویر قاری کے پیش نظر ہو جاتی ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ خاکہ نگاری کسی شخصیت کی عکاسی کا نام ہے۔ اس کے ذریعہ کسی شخصیت کی تصویر کو چمکایا جاتا ہے۔ اردو میں خاکہ نگاری کو مرقع نگاری اور قلمی تصویر بھی کہتے ہیں۔ انگریزی میں خاکے کو اسکیچ یا پین پورٹریٹ کہتے ہیں۔ خاکہ نگاری ایک حد تک لطیف مزاح سے تعلق رکھتی ہے۔ مزاح کا سہارا لے کر کسی بھی شخصیت کے عیوب اور خوبیوں کو اجاگر کیا جاسکتا ہے۔ خاکے میں خاکہ نگار کی ایمانداری، قوت مشاہدہ، احساس تناسب اور تصورانہ مہارت کا امتحان ہوتا ہے۔ ایک چیز ایسی ہے جو خاکے کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ یہ کہ جس کا خاکہ پیش کیا جارہا ہے اس کی کمزوریاں قاری کے دل میں اس کے لئے نفرت نہیں بلکہ ہمدردی پیدا کریں اور خاکہ پڑھ کر وہ بے ساختہ کہے کاش اس شخص میں یہ کمزوریاں بھی نہ ہوتیں۔

خاکے میں کسی شخص کے اہم اور منفرد پہلو اجاگر کئے جاتے ہیں۔ اچھے خاکہ نگار کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شخصیت کے بعض پہلوؤں کی نقاب کشائی ایسی مہارت و ماہرانہ نفاست سے کرے کہ اس کی شخصیت کا اثر قارئین پر خود بخود پڑے۔ ایک اچھا خاکہ وہی ہے جس میں کسی انسان کے کردار اور انداز دونوں کی جھلک ہو۔ خاکہ پڑھنے کے اور اس کی صورت، اس کی سیرت، اس کا مزاج، اس کے افکار، اس کا زاویہ اور خوبیاں اور خامیاں سب نظر کے سامنے آجائیں۔

شاعری میں مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے۔ نثر میں بھی عبارت آرائی اور تخیل کی گنجائش آتی ہے مگر خاکے میں نہ تو جانب داری سے کام لیا جاتا ہے اور نہ ہی خاکے میں مبالغے کی گنجائش ہے۔ اس میں نہ تو کسی کی مدح مقصود ہوتی ہے اور نہ ہی ہجو۔

خاکے کا موضوع عظیم شخصیتیں ہی نہیں معمولی انسان بھی ہو سکتے ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبد الحق نے ''نام دیو مالی'' اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ''کندن'' کا خاکہ لکھ کر یہ واضح کر دیا کہ اچھا برا، چھوٹا بڑا، امیر غریب، ہر طرح کے انسان کا خاکہ لکھا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ خاکہ نگار نے اسے ہر رنگ اور ہر روپ میں نزدیک سے دیکھا ہو۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ خاکہ نگار کا قلم مُردہ جسم میں جان ڈالنے کے ہنر سے پوری طرح واقف ہو۔ خاکہ سوانح عمری سے مختلف ہوتا ہے۔ سوانح عمری کسی شخص کے مکمل حالات زندگی پر تذکرہ و تبصرہ، خیالات و افکار کا آئینہ ہے۔ لیکن خاکے میں اس شخص کے کارناموں سے زیادہ کارگذاریوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ سوانح عمری میں خاکے کی گنجائش ہو سکتی ہے مگر خاکے میں سوانح عمری کی قطعی گنجائش نہیں۔ خاکے میں غیر ضروری تفصیل سے گریز کیا جاتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ خاکہ نہ سیرت نگاری ہے نہ سوانح عمری۔ یہ کسی دل آویز شخصیت کی دھندلی سی تصویر ہے۔ اس میں نہ اس کی زندگی کے اہم واقعات کی گنجائش ہے اور نہ خاص خاص تاریخوں کی اور نہ زیادہ تفصیل کی۔ مصنف نے کسی شخص میں کچھ قابل ذکر خصوصیات دیکھی ہوں اور وہ انہیں دلچسپ انداز سے بیان کر دے تو یہی خاکہ ہے۔

''اردو میں خاکہ نگاری کا میدان وسیع ہے۔ اچھے خاکے کا ابتدائی عکس انشاء خاں انشاؔ کی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ اس میں خاکہ نگاری کی صلاحیت موجود تھی۔ ''دریائے لطافت'' میں اس کے اچھے نمونے ملتے ہیں لیکن خاکہ نگاری کی باضابطہ شروعات دراصل محمد حسین آزادؔ کی معرکتہ الآراء تصنیف ''آب حیات'' سے ہوتی ہے۔ ''آب حیات'' میں اردو شعراء پر تبصرہ و تذکرہ ہے۔ ''آب حیات'' میں خاکہ نگاری کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ آزادؔ کے بعد ''حیات جاوید'' (الطاف حسین حالی) میں خاکے کے کچھ عناصر ہیں، مگر خاکے سے زیادہ سوانح ہے۔ آزادؔ کے بعد فرحت اللہ بیگ سے خاکہ نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ ان میں خاکہ نگاری کی خصوصیات موجود ہیں۔ ''نذیر احمد کی کہانی: کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' اردو کا کامیاب اور اچھا خاکہ ہے۔''

مصنف نے یہ خصوصیات بچشم خود دیکھی ہوں تو کیا کہنا۔ ورنہ منٹو نے "میرا صاحب" لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر بھی ایک کامیاب خاکہ لکھا جاسکتا ہے۔ منٹو نے مسٹر جناح کے ڈرائیور سے اس کے صاحب کے حالات سنے اور یہ خاکہ لکھ کر ان کی زندہ جاوید تصویر بنا دی۔

اس سے پہلے کہ میں اپنے موضوع یعنی "عصمت چغتائی کی خاکہ نگاری" پر اظہار خیال کروں مناسب ہوگا کہ اردو میں خاکہ نگاری کی روایت پر ایک سرسری نظر ڈالتا چلوں۔

اردو میں خاکہ نگاری کا میدان وسیع ہے۔ اچھے خاکے کا ابتدائی عکس انشاء خاں انشاءؔ کی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ اس میں خاکہ نگاری کی صلاحیت موجود تھی۔ "دریائے لطافت" میں اس کے اچھے نمونے ملتے ہیں لیکن خاکہ نگاری کی باضابطہ شروعات دراصل محمد حسین آزادؔ کی معرکتہ الآراء تصنیف "آب حیات" سے ہوتی ہے۔ "آب حیات" میں اردو شعراء پر تبصرہ و تذکرہ ہے۔ "آب حیات" میں خاکہ نگاری کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ آزادؔ کے بعد "حیات جاوید" (الطاف حسین حالی) میں خاکے کے کچھ عناصر ہیں، مگر خاکے سے زیادہ سوانح ہے۔ آزادؔ کے بعد فرحت اللہ بیگ سے خاکہ نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ ان میں خاکہ نگاری کی خصوصیات موجود ہیں۔ "نذیر احمد کی کہانی: کچھ میری کچھ ان کی زبانی" اردو کا کامیاب اور اچھا خاکہ ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں میں "توبتہ النصوح" میں مرزا ظاہر دار بیگ ایک عمدہ خاکہ ہے۔ سرشار نے اپنے ناولوں میں سیرت پر زیادہ زور دیا ہے۔ خوجیؔ کا کردار اس بات کی دلیل ہے۔ فرحت اللہ بیگ کے بعد اردو ادب میں خواجہ حسن نظامی، مولانا عبدالحق، عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، اعجاز حسین، شوکت تھانوی، شاہد احمد دہلوی، اشرف صبوحی، محمد طفیل اہم خاکہ نگار ہیں۔ ان کے علاوہ مشتاق احمد یوسفی، احمد جمال پاشا اور مجتبیٰ حسین نے اچھے اور عمدہ خاکے لکھے۔ نثری ادب میں خاکہ نگاری بہت مقبول ہے۔

عصمت چغتائی ہمارے عہد کی مشہور و معروف فکشن نگار کی حیثیت سے اہمیت کی حامل رہی ہیں۔ لیکن دیگر ادیبوں کی طرح ان کے اظہار کی دنیا بھی وسیع ہے۔ انہوں نے افسانہ، ناول کے علاوہ ڈرامے، رپورتاژ اور خاکے بھی لکھے ہیں۔ میرے خیال میں عصمت چغتائی کے یہ دوسرے گوشے فنی اعتبار سے ان کے نمایاں تخلیقی کارناموں کے مقابلے کسی طرح کم تر نہیں ہیں۔ عصمت چغتائی نے تقریباً گیارہ خاکے لکھے۔ شعور فن کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان کے افسانوی فن کی جولانی ان کے خاکوں میں بھی نظر آتی ہے۔ ناول یا افسانوں میں کرداروں کو تخلیق کرنا بغیر شخصیت فہمی کے ممکن نہیں ہوسکتا۔ ایک فکشن نگار میں شخصیت فہمی کا شعور جتنا گہرا اور بالیدہ ہوگا اس کے تخلیق کردہ کردار بھی اتنے ہی متحرک اور طاقتور ہوں گے۔ عصمتؔ کے فکشن کے کرداروں میں جو ایک رکھ رکھاؤ اور شعور کی بیداری دیکھنے کو ملتی ہے وہ دراصل عصمت کی شخصیت فہمی کے شعور سے ہی پیدا ہوئی ہے۔

عصمت چغتائی کی شخصیت فہمی کی بنیاد کم و بیش انہیں گیارہ خاکوں پر ہے۔ عصمت نے درج ذیل خاکے لکھے جن میں "دوزخی" (عظیم بیگ چغتائی) اسرار الحق مجاز، عشق مجازی (مجاز) میرا دوست میرا دشمن (منٹو) خواجہ احمد عباس، کانٹوں بھری وادیاں (جاں نثار اختر) کچھ میری یادیں (پطرس بخاری) چراغ روشن ہے (کرشن چندر) خوابوں کا شہزادہ (سجاد ظہیر) وغیرہ۔ عصمت کے خاکوں کے بارے میں ڈاکٹر احمد امتیاز لکھتے ہیں:۔

> "عصمت کے خاکوں میں پختہ شعور اور منجھا ہوا آبدار اسلوب اس قدر حاوی ہے کہ شخصیات آب و تاب کے ساتھ اپنی جلوہ گری دکھاتے ہیں۔ ان خاکوں کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ عصمت نے خاکہ نگاری نہیں کی ہے بلکہ اپنی آتش بیانی سے صور پھونکنے کا کام انجام دیا ہے۔"

عصمت کے خاکہ "دوزخی" کے سلسلے میں ڈاکٹر امتیاز کی رائے ہے کہ:۔

> "دوزخی" میں عظیم بیگ چغتائی کی شخصیت، ان کے اعمال و افکار اور حرکات و سکنات کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ان کی زندگی کی مانوس و نامانوس اور علاحدگی کا ملا جلا تاثر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ نفرت اور غم و غصہ کے اظہار میں جہاں عصمت کی بے پناہ محبت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں عظیم بیگ چغتائی کی پُرکشش شخصیت کے وہ پہلو بھی سامنے آتے ہیں جن کو عصمت پوشیدہ رکھنا چاہتی ہیں۔ عصمت نے اس خاکے میں نفی کو اثبات میں بدلنے کی کوشش کی ہے اور اس انداز سے کی ہے کہ عظیم بیگ کی شخصیت جاندار، چلتی پھرتی اور متحرک ہوگئی ہے۔ عصمت کی اس آتش بیان خوبی کے سبب ہی سعادت حسن منٹو کو یہ خاکہ اس قدر پسند آیا تھا کہ ایک موقع پر انہوں نے اپنی بہن سے کہا تھا کہ اقبال اگر میری موت پر تم بھی ایسا ہی ایک مضمون لکھنے کا وعدہ کرو تو خدا کی قسم میں آج ہی مرنے کے لئے تیار ہوں۔

> "دوزخی" میں زبان و بیان کی کاٹ اور طنز کی زہرناکی اس طرح ہے جس طرح عصمت کے افسانوں میں موجود ہے۔"

ڈاکٹر موصوف کے درج بالا خیالات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ "دوزخی" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

> "زبان بد سے بدتر ہوگئی۔ دنیا میں ہر کوئی نفرت کرنے لگا۔ صورت سے جی متلانے لگا۔ ہنستے بولتے لوگوں کو دم بھر میں دشمن بنا لینا بائیں ہاتھ کا کام ہوگیا۔ لیکن مقصد یہ تو نہ تھا کہ واقعی دنیا انہیں چھوڑ دے۔ گھر والوں نے جتنا ان سے کھنچنا شروع کیا، اتنا ہی وہ لپٹے۔ آخر میں تو خدا معاف کرے ان کی صورت دیکھ کر نفرت آتی تھی۔ وہ لاکھ کہتے مگر دشمن نظر آتے تھے۔ بیوی شوہر نہ سمجھتی، بچے باپ نہ سمجھتے، بہن نے کہہ دیا تم میرے بھائی نہیں اور بھائی آواز سن کر نفرت سے منہ موڑ لیتے۔ ماں کہتی سانپ جنا تھا میں نے۔"

ان چھوٹے چھوٹے جملوں سے زبان و بیان کی تیزی، مزاج کی ترشی، طنز کی کاٹ، نفرت کا اظہار، سب کچھ visualise ہوتا ہے۔ عصمت کے افسانوں اور خاکوں میں یہی چیز مشترک ہے۔ عصمت کے مشاہدے میں شخصیت کے مختلف شیڈز، آبجیکٹ کے مقابلے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ سائے پر گہری نظر ڈال کر کردار یا شخص کی شخصیت کو سمجھنے کی ان کی یہ کوشش حیرت میں ڈالتی ہے کیونکہ اس عمل میں وہ اکثر صحیح نتیجے اخذ کرنے میں کامیاب بھی ہوجاتی ہیں۔ عصمتؔ اپنے افسانوں کو ہی نہیں خاکوں کو بھی ذہنی اور عملی زندگی کے تضاد سے ابھارتی ہیں۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:۔

''انہیں دھوکہ باز اور مکار آدمی سے مل کر بڑی خوشی ہوتی تھی۔
یزید کے مداح تھے۔امام حسین کی شان میں بکواس کیا کرتے تھے۔
دنیا میں بڑے دکھ جھیلے مگر سدا مسکراتے رہے۔''

درج بالا دونوں اقتباس میں عظیم بیگ چغتائی کی شخصیت کو جس طرح بے نقاب کیا گیا ہے اس سے وہ سراپا برائیوں کا مجموعہ نظر آتے ہیں لیکن خاکوں کو پڑھ کر قاری کے دل میں ان کے لئے نفرت پیدا نہیں ہوتی بلکہ مترحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یہی عصمت کے فن کی اصل کنجی ہے۔عصمت چغتائی کے خاکہ ''دوزخی'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے انور سدید نے درست لکھا ہے کہ:۔

''عصمت چغتائی نے عظیم بیگ کے خاکے ''دوزخی'' میں اس محبت کو اجاگر کیا جو نفرت کے زیر سطح سدا بہار پھول کی طرح موجود تھی۔ڈپٹی نذیر احمد پر فرحت اللہ بیگ کے بعد دوزخی کو ایک مثالی خاکے کی حیثیت دی گئی اور یہ صنف کی فنی بوطیقا مرتب میں بھی معاون ثابت ہوا''۔

عصمت چغتائی نے مجاز پر تین خاکے لکھے۔''اسرار الحق مجاز، عشق مجازی، اور وہ، بنیادی طور پر یہ صرف مجاز کے شخصی خاکے نہیں بلکہ اس میں خاکہ نگار نے ان کی سوانحی زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔''اسرار الحق مجاز'' ایک جذباتی مضمون ہے لیکن اس خاکے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ مجاز کی شخصیت کو جس اسلوب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہ انوکھا اور دل موہ لینے والا ہے۔اس مضمون کے تین حصے ہیں۔سوانحی حصہ قدرے دل چسپ اور فکر انگیز ہے اور اس حصے میں مجاز کی شخصیت چلتی پھرتی اور متحرک نظر آتی ہے۔ایک طرف طنزیہ طرز بیان اور دوسری طرف جزئیات نگاری اور تیسری طرف مجاز کی زندگی کے چند اہم واقعات۔یہ سب کچھ مصنفہ نے اس طرح ایک دوسرے سے مربوط کئے ہیں کہ شخصیت سازی کے فن کا اصل جوہر اور شخصیت نکھر کر سامنے آگئی ہے۔

مجاز پر لکھے گئے دوسرے خاکوں میں اس خاکے جیسی تندی اور تیزی نہیں ہے۔تاہم یہ بھی عمدہ اور اچھے خاکے ہیں۔

خواجہ احمد عباس کے خاکے میں عصمت لکھتی ہیں:۔

''اسی ٹیڑھے میڑھے انسان میں جملہ چھوٹی موٹی برائیوں کے ساتھ سب سے بھیانک برائی یہ ہے کہ وہ کبھی لائق شوہر نہ بن سکا اور کچھ آثار نظر آتے ہیں۔وہ ایک لاجواب دوست بن سکتا ہے، زنانے دار کہانیاں لکھ سکتا ہے۔فی البدیہہ دھواں دھار تقریریں جھاڑ سکتا ہے۔جٹ جائے تو دنیا کا تختہ اُلٹ سکتا ہے مگر اس میں کسی کا ''سرتاج من سلامت'' بننے کا بیج ہی نہیں ہے۔وہ کسی کا ہو کے رہنے کا قائل نہیں۔خواہ وہ کوئی جذبہ ہو یا پارٹی، کوئی اصول ہو یا کوئی بت کافر اگر اس کا ضمیر کسی بند معن کے خلاف گواہی دیتا ہے تو اسے توڑ پھینکتا ہے۔اسے کسی یقین یا رواج کی رسّیوں میں جکڑنا ممکن ہی نہیں۔وہ نہ کسی کو اپنی جاگیر سمجھتا ہے اور نہ کسی کی ملکیت بن کر جی سکتا ہے۔''

خواجہ احمد عباس کی شخصیت کا یہ وہ پہلو ہے جس پر اسی کی نظر جا سکتی ہے جس نے انہیں خوردبیں نگاہوں سے دیکھا ہو۔منٹو پر لکھا گیا خاکہ بھی بڑا دل چسپ ہے۔منٹو کے حوالے سے لکھتی ہیں:۔

''۔۔۔۔فلیٹ کا دروازہ نیم وا تھا۔ڈرائنگ روم نما ایک کمرے کے ایک کونے میں صوفہ سیٹ پڑا تھا۔کھڑکی سے ملی ہوئی لدی پھندی بڑی سی میز کے سامنے ایک بڑی سی کرسی میں ایک باریک مکوڑے کی شکل کا انسان اکڑوں بیٹھا تھا۔''

درج بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں منٹو کی شخصیت کی پردہ داری کی گئی ہے۔یہاں زبان و بیان میں تیکھا پن ہے اور نہ طنز کے نشتر بلکہ اس کے پس پردہ شوخی اور بے تکلفی کارفرما ہے۔مزید لکھتی ہیں:۔

''بڑی خندہ پیشانی سے منٹو کھڑا ہو گیا۔منٹو ہمیشہ کرسی پر اکڑوں بیٹھا کرتا تھا اور بہت مختصر نظر آتا تھا لیکن جب کھڑا ہوتا تھا تو کھینچ کر اس کا قد خاصہ لمبا نکل آتا تھا اور بعض وقت جب منٹو یوں رینگ کر کھڑا ہوتا تھا تو بڑا زہریلا معلوم ہوتا تھا۔''

عصمت چغتائی کے اور لکھے گئے خاکوں پر اظہار خیال کرنا اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں لہذا میں ڈاکٹر احمد امتیاز کے اس مجموعی تبصرے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔وہ لکھتے ہیں:۔

''خاکہ نگاری کا فن ان معنوں میں ایک مشکل اور پے چیدہ فن ہے کہ اس میں خاکہ نگار متعلقہ شخص کی شخصیت کو ابھارتے ہوئے اپنی شخصیت کو ضم کر دیتا ہے۔مگر اس انضمام کے باوجود اس کی شخصیت اپنا وجود قائم رکھتی ہے۔عصمت کے یہاں بھی یہی کیفیت ہے۔اپنے خاکوں میں انہوں نے اپنی شخصیت کو ضم کر دیا ہے لیکن ان کا کردار اپنا وجود قائم رکھتا ہے۔خاکوں کی تحریروں میں عصمت کا کردار آہستہ روی سے نمودار ہوتا ہے اور ابتدا سے آخر تک اپنا نقش قائم رکھتا ہے۔عصمت نے اپنے خاکوں میں تشبیہات و استعارات سے بہت استفادہ کیا ہے۔ان کے علاوہ بعض جگہوں پر ڈرامائی انداز اور تمثیلی رنگ سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔مجموعی طور پر دیکھا جائے تو عصمت ایک بے باک خاکہ نگار کی حیثیت سے ابھرتی ہیں اور زبان کی کاٹ سے اپنا امتیاز پیدا کرتی ہیں۔''

❑❑❑

ڈاکٹر گل جبین اختر
ایسوسی ایٹ پروفیسر لال بہادر شاستری پی جی کالج، مغل سرائے، چندولی
9450907747

شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری

اردو کے مشہور افسانہ نگار، صاحب طرز نثر نگار، مترجم، انشا پرداز اور اعلیٰ درجے کے ادیب، ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے ساقی کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ صنف خاکہ نگاری میں بھی اپنے فن اور قلم کا جوہر دکھایا ہے۔ اپنے مجموعے 'گنجینہ گوہر' میں مصنف نے اشخاص کے حالات کو خاکوں کی صورت میں موتی کی لڑی کی طرح پرو کر پیش کیا۔ اس کے علاوہ شاہد صاحب نے "دلی کی چند ادبی شخصیتیں" کے عنوان سے کئی اشخاص کے خاکے رسالہ نقوش کے شخصیات نمبر میں شامل ہیں، عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ بھی رسالہ نقوش میں شائع ہوا، ان میں سے کچھ خاکے جمیل جالبی نے مرتب کر کے شاہد احمد صاحب کی شخصیت پر ایک تفصیلی مضمون کے ساتھ بزم خوش نفساں کے نام سے ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا، مضمون میں ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو شاہد صاحب کی شخصیت کا حصہ تھے۔ کتاب کے دیباچے میں جمیل جالبی اس کتاب کو مرتب کرنے کے جواز میں لکھتے ہیں:

> "اس کتاب میں ۱۳ پورے خاکے اور ۱۳ مختصر خاکے یعنی کل ۲۶ خاکے شامل ہیں۔ یہ سب خاکے جہاں زبان و بیان اور شخصیت کے انوکھے پن کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں وہاں یہ سب پہلی بار کتابی صورت میں مرتب و یکجا ہو کر شائع ہو رہے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی نے جہاں ساقی کے ذریعہ کم از کم تین نسلوں کی آبیاری کی وہاں یہ خاکے اردو زبان اور ادب کے وہ رنگین اور خوشبو دار پھول ہیں جو ہمیشہ تازے رہیں گے۔"[1]

خاکہ لکھنے کے کچھ محرکات ہوتے ہیں مثلاً کچھ دلچسپ واقعات ساجھا کرنے یا کسی شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے یا خود اپنی شخصیت کا مشاہدہ کرنا بھی مقصود ہوتا ہے، ان کے علاوہ کسی شخصیت پر قلم اٹھانے کی اور بھی وجوہات ہوتی ہیں۔ شاہد احمد کا خاکہ لکھنے کا خاص مقصد ادیبوں اور شاعروں کی زندگی کے حالات قلم بند کر کے اپنی تصانیف میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لینا تھا۔ قدیم روایات، تہذیب، تاریخی واقعات کو وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ آنے والی نسل کے لیے بچا کر رکھنا چاہتے تھے، اپنے قریبی دوستوں، جن سے وہ خلوت و جلوت میں ملے تھے اور جن کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے اچھی طرح واقف تھے، انکے انداز، بات چیت کا ڈھنگ، پہناوا، لباس، وضع قطع، عادات و اطوار، غرض کہ انکی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔

شاہد احمد کے خاکوں کی تین قسمیں ہیں، توصیفی، جن میں جمیل جالبی کا خاکہ ہے جنہوں نے شاہد صاحب کو خاکہ لکھنے کی تحریک دی، واقعاتی خاکوں میں نذیر احمد اور بشیر احمد کے خاکے شمار ہوتے ہیں جو انکی اسی سعادت مندی کا ثبوت دیتے ہیں اور تیسری قسم ان خاکوں کی ہے جو شخصی خاکوں کے ذیل میں آتے ہیں جہاں متعلقہ شخصیت کی حالات زندگی، اسکے اتار چڑھاؤ، آباواجداد، زیست کی جد و جہد، معرکہ آرائیاں غرض اشخاص کی زندگی کے ہر پہلو کا خوبصورت بیان تاریخی پس منظر میں کیا گیا ہے۔ وہ تاریخ جو شاہد احمد کا سرمایہ تھی، جس سے انہیں والہانہ محبت تھی، جہاں انکے آباواجداد کی مٹی کی مہک تھی، قت نے سب کو اپنی منزلوں تک پہنچا دیا، وقت نے سارے حالات بدل دئے جو کبھی حکومتیں کیا کرتے تھے وہ زمین کے نیچے ابدی

> "نذیر احمد کو انہوں نے اس وقت دیکھا جب وہ محض پانچ برس کے تھے، شعوری طور پر شاہد صاحب کو جاننے سمجھنے اور قریب رہنے کا موقع انھیں نہیں ملا، ایسے خاکے محض سنے سنائے قصوں اور کتابوں میں درج واقعات پر مبنی ہوتے ہیں اسلئے انکا نفسیاتی پہلو زرا کمزور اور ادھورا ہوتا ہے کیونکہ شخصیت نگار کو بذات خود اسے پرکھنے کے لئے وہ شخص موجود نہیں ہوتا اور دوسروں کے بنے پیمانوں اور اصولوں کی بنیاد پر اس شخصیت کو جیسا پیش کیا گیا ہوتا ہے خاکہ نگار کو کم وبیش اسی پر اپنے خاکے کی بنیاد ڈالنی ہوتی ہے اگر چہ اسکا اپنا مطالعہ اور مشاہدہ اس سے مختلف سوچنے پر بھی آمادہ سکتا ہے مگر ذرائع تو پھر بھی وہی ہوتے ہیں۔ عظیم بیگ چغتائی کی کم عمری میں بے وقت موت انکا خاکہ لکھنے کی محرک بنی کیوں کہ عظیم انکے قریبی دوستوں میں شامل تھے۔"

نیند سو گئے انکی جگہ دوسروں نے لے لی، انکا بھی وقت بدلا، اور اس طرح سب کچھ بدلتا ہی رہا اور یہ بدلاؤ ہی اس دنیا کی سب سے خوصورت شہ ہے اور ایک ایسی اٹل سچائی جسے کبھی نہیں بدلا جا سکتا اور اسی بات کو شاہد صاحب نے اپنے خاکوں اور مضامین کے ذریعہ پیش کیا ہے، اپنی کتاب اجڑا دیار کے ایک مضمون میں وہ اس تغیر اور اسکے اثرات کو اس طرح بیان کرتے ہیں جہاں، ماضی کی بازگشت ہے سوز ہے اور سکون بھی ہے۔

''بوڑھا وقت زمانے کی کتاب پر جھکا ورق پر ورق الٹتا چلا جاتا ہے، ہر دفعہ ایک نقشہ دکھاتا ہے یوں ہی نقشے بناتا اور مٹاتا ہے، زمانے کی یہی ریت ہے کہ سدا ایک سا نہیں رہتا، یہی نیرنگی تو دنیا کو خوبصورت بناتی ہے، نئے نئے پہلو دکھاتی اور دلوں کو لبھاتی ہے، مٹے ہوئے نقشوں کی یاد عبارت دلاتی ہے،

مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے
تاریخ کے ہزاروں ورق عظمت رفتہ کی داستان سنا رہے ہیں مسلمان بادشاہ سر زمین ہند پر بادشاہی تھوڑی کرتے تھے خدائی کرتے تھے مگر شائد وہ بھی نمرود کی خدائی تھی کہ اسکا تختہ ہی الٹ گیا،

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے''[۲]

نذیر احمد کو انہوں نے اس وقت دیکھا جب وہ محض پانچ برس کے تھے، شعوری طور پر شاہد صاحب کو جاننے سمجھنے اور قریب رہنے کا موقع انھیں نہیں ملا، ایسے خاکے محض سنے سنائے قصوں اور کتابوں میں درج واقعات پر مبنی ہوتے ہیں اسلئے انکا نفسیاتی پہلو زرا کمزور اور ادھورا ہوتا ہے کیونکہ شخصیت نگار کو بذات خود اسے پرکھنے کے لئے وہ شخص موجود نہیں ہوتا اور دوسروں کے بنے پیمانوں اور اصولوں کی بنیاد پر اس شخصیت کو جیسا پیش کیا گیا ہوتا ہے خاکہ نگار کو کم وبیش اسی پر اپنے خاکے کی بنیاد ڈالنی ہوتی ہے اگر چہ اسکا اپنا مطالعہ اور مشاہدہ اس سے مختلف سوچنے پر بھی آمادہ سکتا ہے مگر ذرائع تو پھر بھی وہی ہوتے ہیں۔

عظیم بیگ چغتائی کم عمری میں بے وقت موت انکا خاکہ لکھنے کی محرک بنی کیوں کہ عظیم انکے قریبی دوستوں میں شامل تھے، لہذا ایک دوست کے جذبات خاکے کے ذریعہ سامنے آئیں اگر چہ انکے جذبات ہر خاکے اور اس سے متعلق شخصیت میں صاف جھلکتے ہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ انکے یہ فور جذبات ہی خاکوں کو لکھنے کے محرک بنا۔ جمیل جالبی کے رشتے شاہد صاحب سے بہت قریبی تھے، پاکستان میں انکے راز دار، غمخوار اور تنہائی کے ساتھی تھے، انہوں نے شاہد صاحب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے۔

''شاہد احمد دہلوی صحیح معنی میں ایک بڑے آدمی تھے۔ ایک تاریخ ساز مدیر تھے، ایک صاحب طرز ادیب تھے، جنکی یادیں میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اب نہ شاہد صاحب ہیں اور نہ 'ساقی' ہے لیکن انکی تحریریں آج بھی ہمارے ذوق ادب کو سیراب کر رہی ہیں۔''[۳]

اب بات کرتے ہیں انکے خاکوں کی زبان پر، جو دلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ بہت صاف، سادہ، سلیس اور بامحارہ ہے جو انکو ورثے میں ملی تھی۔ مناسب جگہ پر مناسب لفظوں کا استعمال انہیں بخوبی آتا ہے، تشبیہات، استعارات، محاورات، ضرب الامثال وغیرہ کو کہاں پر کس سلیقے سے استعمال کرنا ہے اس بات سے وہ واقف ہیں۔ الفاظ سے کھلواڑ اور چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے۔ شخصیت کو مسخ کرنے میں یقین نہیں رکھتے کیونکہ انکا مقصد نہ تو خود کو مشہور کرنا ہے اور نہ دوسروں کی شخصیت کو بے وجہ مشتہر کرنا ہے۔ شاہد احمد صاحب دلی کی زبان پر بہت فخر کرتے تھے، زبان کے برمحل استعمال سے وہ اپنے خاکوں میں شگفتگی پیدا کرتے ہیں، انکی زبان روزمرہ کی بول چال کی زبان ہے جس میں بلا کی روانی ہے، ایک خوبصورت خیال کی طرح نازک ہے لیکن بروقت ایسی دھار دکھاتی ہے کہ اچھے اچھے شہید ہونے سے بچ نہیں پاتے، میراجی کی گندے رہنے کی عادت جگ ظاہر تھی منٹو نے بھی اپنے خاکے میں میراجی کے نانہانے کی عادت اور جسمانی طور پر گندہ رہنے والی بات کہی ہے، شاہد صاحب بھی اسی بات کو الگ انداز میں بیان کر رہے ہیں۔

''میراجی بڑے گندے آدمی تھے، وہ ان میں سے تھے جو کہتے ہیں'' یا نہلائے دائی یا نہلائیں چار بھائی'' انھیں کبھی کسی نے نہاتے نہیں دیکھا کسی کے کہنے سننے کی پرواہ نہیں کرتے اور کسی کی شامت نے دھکا دیا ہے کہ ان سے بھڑے۔ انھیں چھیڑنا تو ایسا ہے جیسے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا، پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔''[۴]

انکی تحریروں میں سنجیدگی کا احساس ہے لیکن شوخی اور ظرافت کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ انداز بیان روزمرہ کی بول چال کے قریب ہے۔ اسلوب بہت دلکش اور جاندار ہے۔ وہ تاثرات میں ترتیب کا لحاظ رکھتے ہیں اور تناسب پیدا کرتے ہیں، انکی تحریروں میں شوخی، سنجیدگی، متانت غرض وہ سب کچھ ہے جو ایک پختہ ذہن کے قلم کار میں ہونا چاہئے۔

''مولوی نذیر احمد میں شوخی وظرافت کا کا عنصر زیادہ تھا۔ پھبتی کسنے اور چوٹ کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے، خود مولوی صاحب کہا کرتے تھے کہ چندہ اگانے کے لئے سرسید نے ہمارا ایک طائفہ تیار کیا ہے، حالی روں روں روں سارنگی بجا رہے ہیں شبلی مجیرے کھڑکھڑا رہے ہیں، ہم طبلہ بجا رہے ہیں اور سید صاحب ہاتھ پھیلا پھیلا کر کہہ رہے ہیں لا چندہ! لا چندہ! غور سے دیکھئے یہ کس قدر مکمل تشبیہ ہے، کارکردگی کے اعتبار سے کس قدر مکمل۔''[۵]

شاہد صاحب مزاحیہ قسم کے آدمی تھے، مزاح انکے خمیر میں تھا انکی طرز ادا اور انداز بیان بہت دلکش اور انوٹھا ہے اسلئے ہر بات اور قلم سے نکلا ہر جملہ مزہ دیتا ہے، انکے خاکوں میں بے تکلفی کی جو صحت مند فضا ملتی ہے وہ خاکوں کو دلچسپ بناتی ہے اور اشخاص کی خامیوں کو اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے، مثلاً کسی کی خامی کو خامی بتا کر لکھنے اور دوسری طرف اسے بے تکلفی کے عالم میں بیان کر جانے میں بہت فرق ہوتا ہے اور اس بات سے دل و دماغ پر ہوئے تاثرات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے اس بات کا خیال شاہد احمد صاحب نے بخوبی رکھا ہے کہ دل آزاری بھی نہ ہو اور طنز کے نشتر چلتے بھی رہیں شخصیت نکھر کر سامنے آتی بھی رہے۔ خواجہ حسن نظامی کی شخصیت کی کچھ کمزوریاں تھیں جنہیں وہی جان سکتا ہے جس نے انہیں قریب سے سمجھا اور جانا ہو، مثلاً انکا خود کی تبلیغ کرنا اور اپنے بارے میں لوگوں سے پرچار کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔

''پروپیگنڈہ خواجی صاحب کی سب سے بڑی قوت بھی تھی اور کمزوری بھی، خوبی بھی اور عیب بھی، اپنی بات منوانے کے لئے وہ جائز و ناجائز، موزوں اور ناموزوں کا امتیاز اٹھا دیتے تھے مثلاً سلطان جی کی باولی پر سے جو گلیارہ بائیں ہاتھ سے اندر جاتا ہے اس کے سرے پر ایک قبر سب سے نمایاں ہے اس پر کتبہ لگوا دیا 'حسن نظامی

کے دادا کی قبر۔واللہ اعلم بالصواب۔اردو کا پروپیگنڈہ کرنے پر آئے تو اپنے ایک گھر کا نام ’اردو منزل‘ رکھ دیا اور اس میں تمام ٹائیل لگوا دیے جن پر ’ہر گھر اردو‘ اور ’گھر گھر اردو‘ لکھا ہوا تھا یہ ٹائیل انہوں نے خود بنوائے تھے اور تلقین فرمائی تھی کہ تمام مسلمانوں کو یہ ٹائیل خرید کر گھر میں لگوانے چاہیے۔‘‘۶

شاہد صاحب میں سب سے بڑی بات شاہد صاحب ایسے انسان تھے جو کبھی کسی سے دبے نہیں اور نہ ہی کسی کے رعب میں آئے، کوئی ہوگا بڑا آدمی تو اپنی جگہ شاہد صاحب اپنے آپ میں ایک شخصیت تھے جسے کسی کے عہدے یا مرتبے سے نہ تو مرعوب کیا جاسکتا تھا نہ ہی امپریس، سادگی اور خوش مزاجی وہ اوصاف ہیں جو انکے خاکوں اور مضامین میں جھلکتے ہیں۔

> ’’ایک دن حسبِ معمول بنیان پہنے، تہمبند باندھے زمین پر بیٹھے پرچہ پیک کر رہے تھے، میں پہنچ گیا میں نے کہا، شاہد صاحب ایسے میں آپکی تصویر لے لی جائے، زور سے ہنسے کہنے لگے ہاں اسکے نیچے لکھ دینا ’پچیس سال ادب کی خدمت کرنے کا حشر‘۔‘‘۷

چہرہ نویسی اور اشخاص کا حلیہ بیان کرنے میں انکا قلم بہت ماہر ہے۔

> ’’میں نے جب سے ہوش سنبھالا انہیں بزرگ ہی دیکھا، سوکھ کر چمرخ ہو گئے تھے، خش خشی داڑھی، بکتری ہوئی لبیں، پوپلہ منہ، دہانہ پھیلا ہوا، بے قرار آنکھیں، ماتھا کھلا ہوا، جوانی میں سرو قد ہوں گے بڑھاپے میں کمان کی طرح جھک گئے تھے، متانہ وار جھوم کر چلتے ہیں، مزاج شاہانہ، وضع قلندرانہ ٹخنوں تک لمبا کرتا، گرمیوں میں موٹی ململ یا گاڑھے کا اور جاڑے میں فلالین یا وائلہ کا، ان میں چار جیبیں لگی ہوتی تھیں جنھیں میر صاحب کہتے تھے ’یہ میرے نوکر چاکر ہیں‘ گلے میں ٹپکا یا گلوبند، سر پر کبھی کپڑے کی گول ٹوپی کبھی صافہ، ایک برا پاجامہ، ازار بند میں کنجیوں کا گچھا، پاؤں میں نری کی سلیم شاہی کبھی صاحب بہادر سے ملنے جاتے تو انگریزی جوتا پاؤں میں اڑا لیتے۔‘‘۸

شاہد صاحب کی نثر میں دلکشی اور شگفتگی ہے، انکی بات سیدھے دل پر اثر کرتی ہے، انکی عبارت کی سادگی ہی انکے خاکوں کی خوبی ہے، نہ تو انگریزی لفظوں کا استعمال کر کے وہ لوگوں پر رعب ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ فارسی، عربی کے بھاری بھرکم الفاظ سے نثر میں شان وشوکت اور گھن گرج کا اضافہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بیچ میں مقامی لفظوں کا استعمال کر کے وہ خاکوں کی کشش میں اضافہ کرتے ہیں مثلا تراہ تراہ پکارنا، ٹوہ لینا، چٹک لینا، ناکہ جوڑی کا بخیہ کرنا، مرجیوڑے، بیرا کھیری مچنا، پتے پانی ہونا، غرض ایسے بہت سے الفاظ شامل ہیں جو وہاں کی عام بول چال میں بولے جاتے تھے۔

شاہد احمد کی نثر کی تین بنیادی خصوصیات ہیں۔ پہلی یہ کہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ بات کرتے ہیں۔ ایجاز و اختصار انکے خاکوں کو سب سے بڑی خوبی ہے جس واقعہ کو دوسرے خاکہ نگار کئی صفحات میں بیان کرتے ہیں شاہد صاحب اسے اسکی تمام جزیات کے ساتھ کم سے کم الفاظ میں بہت دلکش انداز میں بیان کر جاتے ہیں۔

اختصار انکے خاکوں کا وصف ہے اگرچہ خاکے مفصل ہیں لیکن اس بات کا دھیان رکھا گیا ہے کہ یہ تفصیلات قاری کو گراں نہ گزرے، واقعات میں جھول نہ ہو بلکہ ایک دوسرے سے اس قدر پیوست ہوں کہ انہیں جدا کرنا مشکل ہو، ان میں جذبات کی فراوانی، زبان کی روانی اور شخصیت سے اپنائیت ہو کہ قاری اس میں ڈوب جائے، اختصار کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ نثر بوجھل نہ ہو، لفظ کم ہوں مگر معنی زیادہ اور سمجھنے والا اشاروں کنایوں میں کہی بات کی تہ میں پوشیدہ بات کو بھی سمجھ لے لیکن یہ سب اتنے قرینے اور نزاکت سے ہو کہ نثر کی تازگی اور اسکی شگفتگی پر کوئی منفی اثر نہ پڑے، اور شاہد صاحب کی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنی نثر کو عربی اور فارسی کے بھاری بھرکم اور مشکل الفاظ سے بوجھل نہیں بناتے ہیں اور نہ جملوں کی ساخت میں ڈھیلا پن لا کر اسکی روانی پر لگام لگانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ انکی نثر اس قدر سادہ اور سلجھی ہوئی ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ روزمرہ کی زبان میں بات چیت ہو رہی ہے۔

> ’’زبان کا صحیح استعمال اور محاوروں کو برتنے کا سلیقہ انکا خاندانی وصف ہے جو اپنی پوری رچاوٹ اور ایک نئے توازن کے ساتھ انکی نثر میں آ گیا ہے۔ شاہد احمد دہلوی کی نثر میں دلی اسکول کا وہ سارا بانکپن موجود ہے جو ہمیں الگ الگ ڈپٹی نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کے ہاں نظر آتا ہے، انکی نثر میں محاوروں کا استعمال موضوع کی مناسبت کے ساتھ خود بخود ہوتا ہے اور وہ اپنی جگہ ایسے ٹھاٹ باٹ اور ایسے ٹھسے سے جماؤ کے ساتھ آتے ہیں کہ انھیں کسی دوسرے محاورہ یا لفظ سے نہیں بدلا جا سکتا، انکی نثر نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کی نثر کا ایک نیا امکان ہے جس میں شگفتگی اور بانکپن ایک ایسی سنجیدگی کے ساتھ گھل مل گئے ہیں کہ انکی نثر میں ایک خوبصورت توازن بھی ہے اور خوش انداز سنجیدگی بھی۔‘‘۹

انکی نثر کی دوسری خوبی ہے محاوروں کا برمحل استعمال، اپنے خاکوں کی دلکشی مزید بڑھانے کے لئے وہ طرح طرح کی کہاوتوں اور محاوروں کو بھی بیچ بیچ میں ٹانک دیتے ہیں اور وہ ایسی فٹ ہو جاتی ہیں مانو انہیں کے لئے بنی تھیں، عبارت کی خوبصورتی، کشش اور جاذبیت کو وہ تراشے ہوئے لفظوں، تراکیبوں اور چست فقروں سے بڑھاتے ہیں۔

> ’’موج میں ہوتے تو کسی برابر سے گزرتے ہوئے لونڈے کے سر پر چپت جما دیتے، وہ پلٹ کر موٹی سی گالی دیتا تو یہ اس گالی کا مزہ لیتے’ او ہو ہو ہو آہ، ہا ہا ہا۔ دلی کا روڑا ہے، کیا پری دماغ پایا ہے‘ کرتے آگے بڑھ جاتے۔‘‘۱۰

انکی نثر کی تیسری خوبی انکے لہجے میں مٹھاس، گھلاوٹ اور تازگی ہے، بزم خوش نفساں کے دیباچے میں جمیل جالبی انکی نثر کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ’’شاہد احمد دہلوی کی نثر اس سایہ دار درخت کی سی ہے جسکے نیچے بیٹھ کر تھکا ماندہ مسافر تھوڑی دیر آرام کر سکے جسکے میٹھے پھلوں کا ذائقہ ایک طرف اسکی بھوک مٹا سکے اور دوسری طرف اسکے چٹخاروں سے روحانی کیف بھی حاصل کر سکے۔ انکی نثر میں مجھے خوشبو کا احساس ہوتا ہے وہ خوشبو جو جدید نثر میں بہت کم محسوس ہوتی ہے انکی نثر کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہی ہے کہ وہ شگفتہ ہے پڑھنے والا اسے

> مزے لے لے کر پڑھتا ہے اور بات پورے طور پر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔''[۱۱]

انکی تخلیقات میں صداقت اور ایمانداری ہے، بے تعصبی ہے۔ وہ انسان کو انسان سمجھ کر خاکے لکھتے ہیں فرشتہ سمجھ کر نہیں، انھیں اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ انسان اچھائیوں اور برائیوں، خوبیوں وخامیوں کا جیتا جاگتا مجسمہ ہے جس کے پاس ایک دھڑکتا پھڑکتا دل ہے، اس دل میں جذبات ہیں، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس سے کوئی لغزش ہی سرزد نہ ہو، دیکھنے کی بات یہ ہے کی وہ لغزش کس کٹیگری میں آتی ہے، کیا وہ محض ایک لغزش ہی ہے یا کوئی غیر اخلاقی اور انسانیت سے گرا ہوا قدم، جسے اندیکھا نہیں کیا جا سکتا۔

> ''دوسرے اور فنون کی طرح نثر کا بھی یہ کمال ہے کہ آدمی جو کچھ محسوس کرے اور جو کچھ تخیل کے زور سے دیکھے اسے اسی شدت اور جامیعت کے ساتھ لفظوں کی گرفت میں لے آئے تاکہ جب پڑھنے والا اسے پڑھے تو اسکے اندر بھی وہی شدت احساس، جذبہ اور تصویرِ خیال پیدا ہو جائے جو لکھنے والا پیش کرنا چاہتا تھا اس اعتبار سے بھی شاہد احمد دہلوی کی نثر نمونے کی حیثیت رکھتی ہے۔''[۱۲]

اشخاص کی کمزوریوں کا ذکر بھی مزے لے لے کر کرتے ہیں مانو کوئی لنگوٹیا یار اپنے دوست کو چھیڑ رہا ہے اور لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں، شخصیت کی خوبیاں اور خامیاں بیان کرتے وقت بھی اپنے خاکوں میں صداقت کا دامن وہ کبھی نہیں چھوڑتے اگرچہ کچھ باتیں مزاق کے پیرائے میں کہہ جاتے ہیں لیکن اس میں بھی سچائی کا عنصر ہوتا ہے، منٹو کے خاکے میں انہوں نے اسکا ثبوت دیا ہے، منٹو جیسی ایک بڑی اور عظیم شخصیت کی کمیوں کو بھی بیان کرنے میں انکا قلم ہچکچاتا نہیں، منٹو سے پہلی ملاقات میں انکی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی بے تکلفی شاہد صاحب کو ناگوار گزری، اگرچہ وہ منٹو کا انداز تھا جہاں تکلف اور تصنع کی گنجائش نہیں تھی لیکن شاہد صاحب کے لئے یہ بات ناقابل قبول تھی کہ کوئی پہلی ہی ملاقات میں اس طرح پیش آئے اور پینے اس اعتراض کو وہ بغیر سوچے خاکے میں درج کرتے ہیں۔

> ''دبلا ڈیل، سوکھے سوکھے ہاتھ پاوں،، میانہ رنگ، چمپئی رنگ، بے قرار آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک، کریم کلر کا سوٹ، سرخ ٹائی، ایک دھان پان سا نوجوان مجھ سے ملنے آیا، بڑا بے تکلف، تیز طرار چرب زبان بولا۔ 'میں منٹو ہوں' سعادت حسن، آپ نے ہمایوں کا روسی نمبر دیکھا ہوگا اب میں ساقی کا فرانسیسی نمبر نکالنا چاہتا ہوں' پہلی ہی ملاقات میں اسکی یہ ضرورت سے بڑھی ہوئی بے تکلفی طبیعت کو کچھ ناگوار گزری۔''[۱۳]

انکا قلم اس قدر منہ زور ہے کہ کسی کی کھنچائی کرنے اور اسے نشانہ بنانے سے بھی باز نہیں آتا ہے اگرچہ کبھی کبھی اس میں خود کو سیف سائڈ میں رکھ بھی تیر چلاتے ہیں، منٹو کے خاکے میں وہ ستیارتھی کے متعلق منٹو کی زبانی انکی پول کھلواتے ہیں جبکہ قلم خود شاہد صاحب کا چلتا ہے۔

> ''ستیارتھی صاحب نے افسانے لکھے اور سنانے شروع کئے ابتدا میں تو سب نے لحاظ مروت میں چند افسانے سنے پھر کنی کاٹنے لگے، پھر انھیں دور ہی سے دیکھ کر بھاگنے لگے مگر منٹو بھاگنے والا آدمی نہیں تھا، منٹو نے ایک آدھ افسانہ تو سنا اسکے بعد ستیارتھی صاحب کو گالیوں پر دھر لیا، منٹو نے برملا کہنا شروع کر دیا، 'تو تو بہت فراڈ ہے تیری داڑھی داڑھی نہیں ہے پروپیگنڈا ہے، تو افسانے ہم سے ٹھیک کراتا ہے اور جا کر اپنے نام سے چھپوا لیتا ہے' اور اسکے بعد مغلظات سنانا شروع کر دیں منٹو کہتا تھا 'یہ راسپوٹین ہے، ابلیس ہے'۔''[۱۴]

ہر شخصیت کے کئی چہرے ہوتے ہیں، جو باہر دکھائی پڑتا ہے دراصل وہ ویسا ہوتا نہیں، جب تک اسکا نفسیاتی مطالعہ نہ کیا جائے تب تک اسکے نہاں خانوں تک رسائی حاصل کر پانا مشکل ہے اور اسکے لئے بہت مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے، چند ملاقاتوں کی بنا پر کسی نتیجے پر پہنچ پانا ناممکن ہوتا ہے، ہر انسان دوہری زندگی جیتا ہے، ایک سماج کے لئے، ایک اپنوں کے لئے اور ایک خود اپنے لئے، اور اسے ایسا بنانے میں اسکا ماحول ،بچپن، پرورش، اطراف ان سب کا بہت اہم رول ہوتا ہے، منٹو جیسی شخصیتیں تو بڑی تہ دار ہوتی ہیں، جو برسوں میں کھلتی ہیں اگرچہ اسکا دل آئینہ کی طرف شاف اور شفاف تھا، اسکا ظاہر اور باطن ایک تھا پھر بھی کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں ہم مدتوں میں سمجھ پاتے ہیں اور کبھی کبھی سمجھنے میں پوری عمر گزر جاتی ہے، شاہد صاحب جنھیں اسکی پہلی ملاقات کی بے تکلفی ناگوار گزری تھی بعد میں وہ شخص کس قدر اپنا سا لگنے لگا ہوگا جو اس پر انہیں قلم اٹھانے کی اشد ضرورت محسوس ہوئی، سیرت کو صورت کے ذریعہ لوگوں پر آشکار کرانا بھی خاکہ نگار کی ذمہ داری ہوتی ہو اور جس فنکاری سے اس کام کو وہ انجام دیتا ہے اسی میں خاکے کی کامیابی ہے۔

> ''منٹو بظاہر بڑا اکھڑ اور بدتمیز آدمی نظر آتا تھا مگر دراصل اسکے پہلو میں ایک بڑا حساس دل تھا، دنیا نے اسے بڑے دکھ پہنچائے تھے، امیر گھرانے کا لاڈلا بچہ تھا بگڑ گیا اور خوب پیٹ بھر کے بگڑا دوست، احباب، کنبہ دار، رشتے دار سب سے اسے تکلیفیں پہنچی تھیں اس لئے اس میں نفرت کا جذبہ بہت بڑھ گیا تھا مگر اسکی انسانیت مرتے دم تک قائم رہی۔''[۱۵]

وہ اپنے خاکے میں دلی کو پیش پیش رکھتے ہیں، انکے خاکوں میں دلی ایک شہر کا نام نہیں بلکہ ایک ایسے تہذیبی ادارے کا نام ہے جو اپنے اندر صدیوں کی تاریخ سمائے ہوئے ہے، انکے خاکوں میں دلی ہر جگہ موجود ہے، لیکن ایک بیجان شہر کی طرح نہیں بلکہ ایک جاندار کردار بن کر ہم سے مخاطب ہے، ہم رفتہ رفتہ اس سے آگاہ ہوتے چلتے ہیں، اسکی مٹی کی مہک ہمارے دلوں کو معطر کرتی ہے، اسکی جڑوں سے آشنا ہونے کا موقع ملتا ہے، دلی اپنی پوری آب وتاب سے انکے خاکوں میں ہر جگہ ایک روشن مینار کی طرح ہے جسکے اطراف ساری شخصیتیں منور دکھتی ہیں اور یہ کام انہوں نے متعلق شخصیات کے حوالے سے کیا ہے، ایسی ایسی شخصیتیں ہم پر روشن کی ہیں جو خود اپنے آپ میں ایک ادارہ ہیں اور دلی انہیں کے دم سے دل والی بنی۔

> ''دلی بھی عجب شہر ہے کہ اسکے بگاڑ میں ایک بناؤ ہے۔ بیسیوں دفعہ لٹی اور ایسی لٹی کہ کھکھ ہوگئی مگر پھر آباد ہوگئی اور ایسی آباد ہوئی کہ پہلے سے بھی اسکی رونق بڑھ گئی، باہر والوں کو دلی ہمیشہ راس آئی ہے۔ یہ بھی اس شہر کی خصوصیت ہے۔ ڈپٹی بہاوالدین مرحوم کے

صاحبزادے سلطان الدین صاحب نے اس خصوص میں ایک بڑی دلچسپ بات بتائی، انہوں نے کہا کہ 'میری دادی صاحبہ فرماتی تھیں کہ دلی دلی والوں کی بیوی ہے اور باہر والوں کی ماں'۔ میں نے دادی صاحبہ سے پوچھا کہ اسکا مطلب کیا ہے؟ فرمایا 'بیوی کی نگاہ شوہر کی جیب پر رہتی ہے اور ماں کی نگاہ اولاد کے پیٹ پر رہتی ہے'۔"[16]

شاہد صاحب دلی والوں کی خوبیاں اور خامیاں دونوں چٹخارے لے لے کر بیان کرتے ہیں، کسی کی تنک مزاجی مشہور ہے تو کسی کی انکساری، کوئی قلندر صفت ہے تو کوئی حساب کتاب کا ماہر، کوئی ہمیشہ لئے دئے رہنے والا انسان ہے تو کوئی اپنی اکڑ اور شان کا مارا کہ ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتا، کوئی حالات کا مارا ہے تو کوئی سیاست کا، غرض ہر طرح کے موتی ہر طرح کے پھول انکے گلشن میں ہیں، دلی والوں کی ہر چھوٹی بڑی عادت کو بھی بے نقاب کیا ہے، استاد بیخود دہلوی کے خاکے کے ذریعہ دنیا کو بتایا کہ دلی والے کیسے زبان کے چٹورے ہوتے ہیں کہ جان جائے خرابی سے ہاتھ نہ اٹھے رقابی سے۔

"راستے میں دہی بڑے والا نظر آ گیا، مرض ورض سب بھول گئے، آخر دلی والے تھے چٹورپن نے زور مارا اور خوب ڈٹ کے دہی بڑے کھائے، اس وقت تو مزہ آ گیا مگر بعد میں اسکی کٹر نکلی۔"[17]

دلی کی اصطلاحات و رسومات کا ذکر ہے، وہاں کے محلات، باغات، مکانات، سبھی کا ذکر ہے جو آج دلی کے نقشے سے غائب ہو چکے ہیں یا کسی اور نام اور پہچان سے درج ہیں،، غپ بازیاں بھی خوب کی ہیں، شخصیتوں کی پسند ناپسند، انکی شوخ اور شرارتی قصے، مشغلے، عشق و عاشقی کے زمانے، مشاعروں کے روداد یں غرض سب کچھ ہے جو ہمیں اس دور میں کھینچ کر لے جاتا ہے۔

"شاہد صاحب دلی کے داتی ہیں۔۔۔ محبت ہے"[18]

انکے خاکوں کی اپنا ایک جدا رنگ ہے اور مہک ہے، وہ جدید اور روایت کا بہترین سنگم ہے۔ انکے خاکے ایک مٹتی ہوئی تہذیب کے گواہ ہیں، ایک اہم دستاویز ہیں اس شہر کے جو کئی بار اجڑا اور کئی بار بسا اور یہ سلسلہ بدستور جاری ہے، انکی کتاب اسی شہر کی تاریخ میں ایک میل کا پتھر ہے۔ اس شہر سے انکا لگاؤ اور انسیت، اس تہذیب سے انکا جڑاؤ، وہاں کے لوگوں سے انکی والہانہ محبت، اپنے بزرگوں کے تئیں انکا احترام غرض یہ وفور جذبات ابھر ابھر کر انکے قلم سے نکلے ہیں جسے پڑھ کر کوئی بھی آسانی سے اندازہ لگا سکتا ہے کی وہ اپنی سنہری تاریخ کو لے کر کس قدر نوسٹیلجک تھے اور یہ نوسٹیلجیا ہی ماضی کے ان اوراق کو صفحات پر اتارنے کا محرک بنا، دلی کی فضا، وہاں کو موسمات، رسومات، تیج تیوہار، محلات باغات ایسا کیا بچا ہے جو انکے خاکوں میں موجود نہیں، دلی کی محلات اور حویلیوں کے ذکر میں وہ پوری جزیات سے کام لیتے ہیں، میر صاحب کی حویلی کو نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں جیسے ہمیں جسمانی طور پر اپنے پیچھے پیچھے اس حویلی کے اندر لے جا رہے ہیں اور ہم اپنی ننگی آنکھوں سے وہ سارا منظر دیکھ رہے ہیں۔

"میر صاحب کی حویلی، حویلی کا ہے کو محل سرا کہنا چاہئے۔ کے تین حصے تھے، زنانہ جس میں کشادہ دالان در دالان، مغل محرابوں والے ان پر پٹا پٹی کے روئی بھرے دبیز پردے پڑے ہوئے، دالان میں دائیں بائیں کوٹھریاں تھیں پیش دالان کے آگے صحن چبوترہ اسکے پہلوؤں میں صحنچیاں، نیچے کے رخ دائیں جانب ایک سہ دری تھی جس میں کیواڑ لگا کر کمرہ بنا لیا تھا، جہاں زنانہ مکان کی حد ختم ہوتی تھی اسی سے ملواں ایک اور حصہ تھا جسکا ایک دروازہ زنانے کے صحن میں کھلتا تھا اس حصے میں ایک دالان تھا اور پہلو میں کمرے تھے مکان کے اس حصے میں میر صاحب کا کتب خانہ اور نوادر خانہ تھا، زنان خانہ اور کتب خانہ کی پوری لمبان بازار کے رخ ایک چوڑی پٹی پر مردانہ بنا ہوا تھا۔ اسکے اندر ڈیوڑھی تھی جس میں ایک بڑے سے تخت پر دربان بیٹھا رہتا تھا یہیں سے زنانہ مکان اور کتب خانے کے راستے جاتے تھے بالا خانے پر دائیں طرف ایک برآمدہ تھا جس میں میر صاحب کا بیشتر وقت گزرتا تھا اسکے پیچھے ایک چوکور سا بڑا کمرہ یا ہال تھا جس میں ادبی نشستیں ہوتی تھیں۔ یہ پورا مکان فراش خانہ میں 'نمک والوں کی حویلی' کے نام سے مشہور تھا کیونکہ میر صاحب نمک کے محکمے میں ملازم رہے تھے۔"[19]

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ انکی شخصیتیں بھی انکی طرح کمال کی ہیں، یہ ایک اتفاق بھی ہو سکتا ہے یا پھر مصنف کی نظر ہی ان پر گئی جن سے انکے رشتے انہیں خصوصیات کی وجہ سے بنے اور آگے تک چلے، خاکوں کے درمیان میں وہ خود کا تذکرہ نہیں کرتے بلکہ جہاں بہت ضروری اور ناگریز سمجھتے ہیں وہاں بہت احتیاط سے اپنا ذکر خاکے کو اٹھانے کے لیے کرتے ہیں جس سے پیش کردہ شخصیت کے تمام حالات مکمل طور پر سامنے لا سکیں۔ انکا مقصد اپنے نام کا اشتہار کرنا یا متعلقہ شخصیت کو بدنام کرنا انکی منشا ہوتی ہے دوسرے خاکہ نگاروں کی طرح انہیں اپنے کو پیش پیش رکھنے کا شوق نہیں ہے اور نہ ہی متعلقہ شخصیت کسے وہ کسی طرح مقابلہ یا موازنہ کرنا مقصود ہے، انکا واحد مقصد شخصیت کی رونمائی کرنا ہے، وہ خاکے کی نذاکت اور بحیثیت خاکہ نگار اپنی ذمہ داری اور حدوں کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ ان کے خاکوں کی ایک بڑی خوبی انکی جذیات نگاری ہے، جس بات کا تذکرہ کرتے ہیں اسکا پورا نقشہ اتار دیتے ہیں، جس رسم کا بیان کرتے ہیں اسکی چھوٹی سے چھوٹی تیاری کو بھی مرحلہ وار اور پوری شان و شوکت کے ساتھ لکھتے ہیں، دلی کے میلے ٹھیلوں کا ذکر ہو یا شادی بیاہ کے رسومات کا بیان، نوابوں کے گھروں کے محفلیں ہوں یا تیج تہوار، یہاں تک گود بھرائی کی رسم سے لے کر زچگی تک ہر محفل ہر تقریب ہر جشن کے بیان میں جذیات نگاری کا فن دیکھتے ہی بنتا ہے، ہر تقریب کے مطابق الگ الگ گیت گانے کا رواج تھا ان گیتوں کا ایک انتخاب انکے مضامین میں موجود ہے۔

واقعات کے اندر واقعات بیان کرنے کا ہنر انہیں بخوبی آتا ہے، کسی بات کو واضح کرنے یا اسکی شہادت دینے کے لئے وہ متعلقہ شخصیت سے جڑے تمام واقعات تفصیل سے بیان کرتے ہیں، بڑے لوگوں کے متعلق وہ باتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال لاتے ہیں جن سے عام انسان نا آشنا ہوتا ہے مثلاً خواجہ حسن نظامی کا لوگوں کو خطابات سے نوازنے کا انداز اور فن، مثلاً دیوان سنگھ کو مفتوں کے خطاب سے فہرست میں اور بھی نام ہیں جو اس اقتباس میں نوٹ کئے گئے ہیں۔

"خواجہ صاحب کو خطاب دینے اور نام رکھنے کا عجب سلیقہ

تھا۔علامہ راشدالخیری کو 'مصورغم'،خواجہ صاحب ہی نے خطاب دیا تھا،میرے والد کو ''وارث الادب' کہتے اور لکھتے تھے اور خود 'مصور فطرت' تھے،انکی بیگم خواجہ بانو ہیں،ایک بیٹی حور بانو اور دوسری روحہ۔ ضیاالدین کو انکی تاریخی معلومات کی وجہ سے برنی خطاب دیا تھا کوئی 'ناسوتی نظامی' تھے تو کوئی 'ابن عربی'۔ ایک صاحب ملنسار نظامی کہلاتے تھے۔بھیا احسان کشفی شاہ تھے،ایک صاحب مستری عشقی کہلاتے تھے،کوئی جمالی تھا کوئی غزالی،ایک تھے قلندر نظامی۔''۲۰

میر ناصر علی کے خاکے کے ذریعہ قاری کو انکے مہمان خانے سے لے کر زنان خانے یہاں تک باورچی خانے میں جھانکنے کا موقع ملتا ہے وہ، کتنا کھاتے تھے،خانا پکانے پر کون معمور تھا،مامائیں کیا پکاتی تھیں،باقی کے نوکر چاکر کس کام پر معمور تھے،وغیرہ وغیرہ،ہمیں اس خاکے کی بدولت ہی معلوم ہوا کہ میر صاحب کے یہاں خانساماں کے طور پر مامائیں رکھی جاتی تھیں کیونکہ چوڑیوں کی کھنک آٹا گھوندھنے اور روٹی پکانے میں شامل نہ ہو تو روٹی میں ذائقہ نہیں آتا،غرض اس طرح کی تمام مثالیں انکے خاکوں میں موجود ہیں جو ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہیں۔اسی طرح بیخود دہلوی کا خاکہ پڑھ کر ہمیں انکی رنگین طبیعت اور زندہ دلی کا اندازہ ہوتا ہے۔

''بیخود صاحب اس وقت اسی کے اوپر ہو چکے تھے،ہاتھوں میں رعشہ آگیا تھا،چہرہ چرمرا کر رہ گیا تھا،رنگ گھٹا ہوا گندمی،سفید براق سر سیدی داڑھی،لبیں ترشی ہوئی،اتنی عمر ہونے پر خاصے ٹانٹے تھے اور سیدھے چلتے تھے،بتیسی پوری نقلی چڑھی ہوئی تھی،جسکا تالو اکثر ڈھیلا ہو جاتا اور بات کرنے میں پورا جبڑا نیچے آرہتا،پھر اسے چبا کر ٹھیک کرتے تو بات کرتے،لہجہ خالص دلی والوں کا تھا،تکلف سے بری اور آواز اونچی اور قراری تھی،جب موج میں آتے تو بے ساختہ گالیاں بھی شروع کر دیتے مگر بڑی برجستہ۔''۲۱

اشخاص کا حلیہ بیان کرنے میں انکے قلم کی تیزی اور روانی دیکھتے ہی بنتی ہے، نک سکھ بیان اس طرح کرتے ہیں جیسی شخصیت کسی آئینہ کے سامنے کھڑی کر ہو گئی ہے،ہو بہو وہی چہرہ،چہرے کی لکیریں،وہی لباس،لباس کی سلوٹیں،وہی لب ولہجہ،لہجہ کے اتار چڑھاؤ سب کچھ بہت حقیقی معلوم ہوتا ہے،حلیہ بیان کرنے میں زبان اس قدر شوخ ہو جاتی ہے کہ مزہ آجاتا ہے خواجہ حسن نظامی کا حلیہ اس طرح لکھتے ہیں۔

''لمبا اونچا قد،چھریرہ بلکہ دبلا بدن سر پر کلاہ نما پیلی ٹوپی،لمبا سا چغہ،بڑے پائچوں کا پاجامہ،پاؤں میں دیسی جوتی،،رنگ شہابی ،چہرہ کتابی، آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک جس میں سے آنکھیں ہیرے کی طرح جگر جگر چمکتی تھیں،سواسی ناک،موزوں دہانہ،،لب زرا موٹے، کترواں لبیں،مٹھی بھر پھریری داڑھی سراحی دار گردن،شانوں پر کاکلیں کالے ناگوں کی طرح لہراتی اور افعی کی طرح بل کھاتی چلتے تو کڑی کمان کے تیر کی طرح،بیٹھتے تو لاکھوں من کے بیٹھے معلوم ہوتے۔''۲۲

وہ اپنے خاکوں میں ایک کردار کی سی حیثیت رکھتے ہیں جو قاری سے رازدانہ طور پر باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔وہ خاکے کے بنیادی لوازمات کا پورا خیال رکھتے ہیں اور ایک خاکہ نگار کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری بخوبی سمجھتے ہیں۔

انھوں نے چھوٹے چھوٹے واقعات سے اپنے خاکوں میں دلچسپی اور جاذبیت پیدا کی ہے اور شخصیت کی زندگی اور اسکے حالات کا پورا نقشہ قاری کے سامنے لائے ہیں۔واقعات کے ذریعہ انہوں نے اشخاص کے کردار،انکی زندگی کے حالات،انکے دور اور ادبی زندگی پر روشنی ڈالی ہے

''ایک دن ایک صاحب ایک مضمون لکھ کر لے گئے جسکا عنوان تھا 'داغ کی شاعری پر ایک نظر' میر صاحب نے عنوان دیکھتے ہی فرمایا 'ایک نظر کیوں دو نظر کیوں نہیں' یہ کہ کر مضمون واپس دے دیا۔''۲۳

منظر نگاری بھی خاکوں میں دلکشی پیدا کرتی ہے۔شخصیت کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کے بیان میں بھی منظر نگاری بہت تاثر پیدا کرتی ہے۔شاہد احمد صاحب کا مشاہدہ تیز اور وسیع ہے۔شخصیات کی خوبیوں اور خامیوں پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں کوئی لاگ لپیٹ نہیں رکھتے اور اشخاص کی اچھائیوں اور برائیوں پر اپنی ذاتی رائے یا پسند اور ناپسند نہیں تھوپتے بلکہ شخصیت کو من وعن بیان کر جاتے ہیں۔انکی تخلیق کردہ شخصیتیں نہ تو فرشتوں کی شکل میں آتی ہیں نہ تو حیوانوں کی،وہ انسان ہیں اور انسانوں کی ہی صورت میں سامنے آتی ہیں۔شاہد صاحب کی زبان ،انکا اسٹائل،انکا موضوع اور انکا عندیہ سب کچھ لاجواب ہے،لیکن ایک بات تھوڑی گراں گزرتی ہے وہ یہ کہ کچھ خاکے ایسے ہیں جن کی تعریف و توصیف میں انہوں نے کئی صفحات لکھ ڈالے مثلاً خواجہ حسن نظامی کا خاکہ،انکی زندگی کے ہر پہلو پر انکی شخصیت،انکی شہرت اور یہاں تک حلیہ بیان کرنے میں بھی خوب سے خوب تر لکھا اور کچھ ایسے بھی شخصیتیں ہیں جن کی تعریف کے لئے انکے پاس لفظوں کا قحط جیسا پڑ گیا تھا،خواجہ صاحب کی کامیابیوں کے متعلق لکھتے ہیں 'زندگی کے ہر شعبہ میں حیرتناک ترقی کی ،اور یہ بخشش خدائے دو جہاں کی طرف سے بھیجی تھی،خواجہ صاحب نے جو کام کیا وہاں کامیاب ہوئے وہ ادب کا میدان ہو یا سیاست کا،اگر مٹی میں بھی ہاتھ ڈالا تو سونا بن گئی'۔

اسی طرح کی تعریفوں سے کئی صفحات بھرے ہوئے ہیں،نذیر احمد سے انکی ملاقات اس عمر میں ہوئی جب وہ محض ۵ برس کے تھے،اور انکی قربت بھی انہیں کم نصیب ہوئی پھر انکے بارے میں ہر بات اتنے وسوخ سے کہنا کہاں تک صحیح تھا،اگر چہ پورا خاکہ واقعات کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے لیکن ان واقعات کا سورس کیا تھا اور کتنا مستند ہے اسکا کوئی ذکر نہیں ہے نذیر احمد اور میر ناصر علی دونوں ہی اس وقت دنیا سے کوچ کر گئے جب وہ بہت کے تھے،ایسے میں انکی معلومات کے ذرائع کی تصدیق کئے بغیر ہم یہ نہیں کہ سکتے کہ آیا انکا جو نفسیاتی پہلو دکھانے کی کوشش کی ہے اس میں کتنی صداقت ہے۔

خاکے میں اختصار اسکی خوبصورتی کو بڑھاتا ہے کہا تو یہاں تک جاتا ہے کہ خاکہ اتنا بڑا ہو کہ ایک ہی نشست میں ختم ہو جائے ،شاہد صاحب کے کچھ خاکوں میں ضرورت سے زیاد تفصیلات پر زور دیا گیا ہے،جذیات نگاری کہیں کہیں بوجھل سی ہو جاتی ہے،مثلاً اگر حویلی کا نقشہ کھینچ رہے ہیں تو کئی صفحات اس میں خرچ کر دیتے ہیں یا کسی تقریب کا ذکر ہو یا کسی کی

شان وشوکت دکھانی ہوتو انکا قلم کچھ زیادہ ہی فراخ ہو جاتا ہے۔

خاکے لکھنے کا مقصد کیونکہ ایک مٹ چکی تہذیب کو سمیٹنا تھا ،اسکی پر جلال ،پر شکوہ اور سنہرے دور کو ہمارے سامنے زندہ لا کر کھڑا کرنا تھا وہ بھی اسی پس منظر میں ،انکا سارا فوکس اسی پر تھا اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں لیکن اس سے ہوا یہ کہ کچھ خاکے نفسیاتی مطالعہ رہ گیا،انکے خاندان،انکے رعب ک اور جلال کے آگے انکا قلم نفسیاتی گرہوں کہ کھولنے سے چوک گیا۔خاکوں میں واقعات کی بھر مار ہے،انہوں نے شخصیت کو واضح کرنے کے لئے چن چن کر واقعات یکجا کئے ہیں لیکن واقعات کے اندر واقعات ایسا لگتا ہے سوائے واقعات کے انہوں نے ان اشخاص کا ادبی اور نفسیاتی مطالعہ کم کیا تھا۔غرض کہ شاہد صاحب نے جب اپنی متعلقہ شخصیتوں کے متعلق یہ لکھ دیا کہ وہ کوئی فرشتہ تھوڑی ہیں کہ جن سے غلطیاں نہ ہوں تو شاہد صاحب کے متعلق ہم بھی یہ ہی کہیں گے کہ جب اتنے خالصورت اور دلچسپ خاکے کے پڑھنے کو ملے تو یہ چھوٹی چھوٹی کوتاہیاں نظر انداز کر کے انکا مزہ لیا جانا چاہئے کیونکہ یہ خاکے نہ صرف ہمیں لطف اندوز کرتے ہیں بلکہ بیک وقت ہماری معلومات میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔بحیثیت مجموعی انکے خاکے صنف خاکہ نگاری کے اعلیٰ نمونے قرار دئے جاسکتے ہیں۔جن اشخاص پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے وہ دنیائے ادب میں انکی تصنیف کی طرح زندہ جاوید ہوگئی ہیں۔

کتابیات

۱۔صفحہ ۹،بزم خوش نفساں (شخصی خاکے) شاہد احمد دہلوی،مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی،مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۸۵

۲۔صفحہ ۱۱۱،مضمون دلی کا ایک شریف گھرانہ،اجڑا دیار شاہد احمد دہلوی،ایم آر پبلیکیشنز،نئی دہلی،۲۰۱۲

۳۔صفحہ ۱۰،بزم خوش نفساں (شخصی خاکے) شاہد احمد دہلوی،مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی،مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۸۵

۴۔صفحہ ۲۴،گنجینہ گوہر،شاہد احمد دہلوی،،مکتبہ نیا دور کراچی،۱۹۶۲

۵۔صفحہ ۲۳۔۲۴ گنجینہ گوہر۔

۶۔صفحہ ۷۱ گنجینہ گوہر

۷۔صفحہ ۱۷،بزم خوش نفساں

۸۔صفحہ ۳۰ گنجینہ گوہر

۹۔صفحہ ۳۱۔۳۲،بزم خوش نفساں

۱۰۔صفحہ ۳۹ گنجینہ گوہر

۱۱۔صفحہ ۲۹بزم خوش نفساں،

۱۲۔صفحہ ۳۰،بزم خوش نفساں

۱۳۔صفحہ ۱۴۴،گنجینہ گوہر

۱۴۔صفحہ ۱۴۸ گنجینہ گوہر

۱۵۔صفحہ ۱۵۲،گنجینہ گوہر

۱۶۔صفحہ ۱۲۲،اجڑا دیار

۱۷۔صفحہ ۶۳ گنجینہ گوہر

۱۸۔صفحہ ۲۰بزم خوش نفساں

۱۹۔صفحہ ۳۳۔۳۴،گنجینہ گوہر

۲۰۔صفحہ ۶۸ گنجینہ گوہر

۲۱۔صفحہ ۵۰ گنجینہ گوہر

۲۲۔صفحہ ۶۵ گنجینہ گوہر

۲۳۔صفحہ ۳۹،گنجینہ گوہر

۲۴۔صفحہ ۳۵،گنجینہ گوہر

❑❑❑

غزل

پندارِ صنم ، زینتِ رخسار ہیں آنکھیں
اے اہلِ نظر ! حسن کا معیار ہیں آنکھیں

ہر صورتِ رنگین سے بیزار ہیں آنکھیں
دیرینہ مناظر کی طلب گار ہیں آنکھیں

ڈھونڈو گے تو ہر ایک صفت ان میں ملے گی
بیدار ہیں، ہشیار ہیں، عیار ہیں آنکھیں

آنکھیں ہی بتاتی ہیں ہمیں حال بھی دل کا
پوشیدہ ہر اِک راز کا اظہار ہیں آنکھیں

گو لاکھ حسیں ہوں وہ سخن بار نگاہیں
گر ہوں نہ حیادار تو بے کار ہیں آنکھیں

منسوب نہ کر مے سے مری ذات کو زاہد !
میں رند کہاں، بس مری مے خوار ہیں آنکھیں

مشتاقؔ بنی جس کے فقط کُن سے یہ دنیا
اس خالق فن کار کا شہکار ہیں آنکھیں

ثقلین مشتاق

17 ایسٹ ہاؤس نمبر 04 مانگو جمشید پور جھارکھنڈ

9304297881

ڈاکٹر علی اکبر شاہ
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی، دہلی
9899058990

ایک تحقیقی محاسبہ: احمد معمار اور امام الدین ریاضی

تاج محل بے شک فارسی تہذیب اور ثقافت کی جانب سے ہندوستانی قدیم تہذیب کیلئے ایک ایسا دائمی تحفہ ہے جو ان دو قدیم تمدنوں کی قربت دوستی اور اشتراک کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا رہے گا۔ جہاں تاج محل اپنی بے مثال خوبصورتی اور لازوال عشق ومحبت کی نشانی کی حیثیت سے عجائب دنیا میں شامل ہے وہیں یہ اسرار و رموز کا ایسا مجموعہ ہے جس کی ساری پرتیں ابھی تک کھل نہیں پائی ہیں۔ یہی کم استعجاب اور حیرت کی بات نہیں ہے کہ 1653ء میں پایہ تکمیل تک پہونچنے والی اس مثالی عمارت کو اپنے اصلی معمار کے تعین کیلئے تقریبا تین صدیوں تک انتظار کرنا پڑا۔ اس لمبے عرصے میں کئی خوش قسمت لوگوں کا نام اصلی طرّاح کی حیثیت سے تاج محل سے جڑا- کچھ محققین نے جیرونیمو یرونیوا ٹلی کے ایک سنار اور کبھی فرانس کے سونے اور چاندی کے زیورات کے تاجر آسٹن دے بردا کس کو اس اتفاقی اور موقتی اعزاز سے نوازا اور کچھ نے علی مردان خان شاہجہانی دور کے مشہور مہندس کے سر پر یہ سہرا سجایا- کمزور شواہد اور مفروضات کی بنا پر سستے میں بٹنے والے اس اعزاز کو حاصل کرنے والوں کی اس فہرست میں چند اور نام بھی شامل ہیں یہ فہرست گنجائشوں، مصلحتوں اور وقت گزرنے کے ساتھ اور بھی طویل ہوتی لیکن 1930ء میں بنگلور کے ایک محقق سید محمود خان کے ہاتھوں دیوان مہندس نامی فارسی مخطوطہ کی کھوج نے کئی لوگوں سے اس اتفاقی خوش بختی کی توفیق اجباری کو سلب کرلیا۔ سید محمود اپنے ذاتی کتبخانے میں قلمی نسخوں کی جانچ پڑتال میں مصروف تھے کہ دیوان مہندس نامی اس مخطوطے پر ان کی نگاہ پڑی۔

یہ لطف اللہ مہندس کا دیوان تھا۔ دیوان کی ورق گردانی کے دوران محمود خان کی نگاہ درج ذیل ابیات پر پڑی :

احمد معمار کے در فن خویش — صد قدم از اہل ہنر بود پیش
از طرف داور گردون جناب — نادر عصر آمدہ او را خطاب
بود عمارت گرِ آن بادشاہ — داشت در آن حضرت فرخندہ جاہ
آگرہ چو شد مضرب رایات شاہ — بس کہ برو بود عنایات شاہ
کرد بحکمِ شہ کشورکشا — روضہ ممتاز محل را بنا
باز بحکمِ شہ انجم سپاہ — شاہجہان داورِ گیتی پناہ
قلعہ دہلی کے ندار د نظیر — کرد بنا احمدِ روشن ضمیر
این دو عمارت کے بیان کردہ ام — در صفتش خامہ روان کردہ ام
یک ہنر از گنج ہنرہای اوست — ایک گہر از کانِ گہرہای اوست

ان ابیات کو دیکھنے کے بعد ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ان کو اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ ایک نہایت ہی اہم اور تاریخی معمّے کو حل کرنے کے بہت نزدیک پہونچ چکے ہیں۔ چونکہ ان اشعار میں لطف اللہ مہندس نے صریحاً اپنے والد احمد معمار کو کہ جسے بادشاہ شاہجہان کی جانب سے نادرِ عصر کا خطاب ملا تھا، تاج محل اور دہلی کے لال قلعے کا معمار قرار دیا ہے، لیکن محمود خان اس بڑی علمی دریافت اور کامیابی کی سندیت سے پورے طور پر مطمئن ہوئے بغیر اسے منظر عام پر نہیں لانا چاہتے تھے لہذا انہوں نے ایک خط کے ہمراہ مخطوطے کو اعظم گڑھ میں سید سلیمان ندوی کے پاس بھیج دیا۔ سید سلیمان ندوی نے اس دیوان کی دستیابی کو

”پروفیسر نذیر احمد نے مخطوطے کے دونوں حصوں کی بے ترتیبی کے باجود بڑی محنت سے ابواب کے عناوین اور ان کے مطالب کا تعارف پیش کیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے دونوں حصوں کے مطالعہ کے نتیجہ میں امام الدین ریاضی کے تذکرہ باغستان کے منابع ومصادر کی فہرست بھی مرتب کی ہے جو کم و بیش 80 کتابوں پر مشتمل ہے- تذکرہ باغستان جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا 12 ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب ایک مخصوص موضوع کا حامل ہے- ان ابواب میں دو باب خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ چھٹا باغ جو کہ مختلف صوفی سلسلوں کے بیان اور صوفیاء کے مختصر اور مفصّل شرح حال پر مشتمل ہے اور نواں باب جو کہ شاہجہاں اور اورنگزیب کے زمانے کے شاعروں کا تذکرہ ہے- صوفی سلسلوں کے باب میں سلسلہ قادریہ چشتیہ، نقشبندیہ، اور شطّاری سلسلوں کا مفصّل طور پر ذکر کیا گیا ہے-“

ایک بڑا علمی انکشاف مانتے ہوئے اس میں موجود اسامی کے متعلق مزید معلومات بہم پہونچانے کی غرض سے معاصر معتبر مراجع کی طرف رجوع کیا لیکن کوئی خاطر خواہ کامیابی ہاتھ نہیں لگی اس دوران ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کا معارف اعظم گڑھ میں چھپا ہوا ایک مضمون ان کی نظر سے گذرا جس میں ڈاکٹر چغتائی نے تاج محل اور اس کی تعمیر سے متعلق مختلف موضوعات پر بحث کی تھی۔ اس مضمون میں احمد لاہوری کا نام ضرور آیا تھا لیکن تاج محل کے اصلی معمار کے طور پر نہیں۔ سید سلیمان ندوی نے 11 مارچ 1931 کو ڈاکٹر چغتائی کے نام ایک استفسارانہ مکتوب ارسال کرتے ہوئے احمد لاہوری کے متعلق ان کی نظر سے گزرنے والے مراجع کی طرف راہنمائی کی درخواست کی، ڈاکٹر چغتائی نے ندوی کی طرف سے پے در پے دو یاد دہانیوں کے بعد مسئلے کی سنگینی کو سمجھتے ہوئے جواب میں ذاتی مجموعہ کتب میں موجود شاہجہانی دور کے اس خط کی طرف اشارہ کیا جو کسی نامعلوم فرد کی طرف سے عمدۃ الملوک نواب جعفر خان کو لکھا گیا تھا۔ نواب جعفر خان تب شاہجہاں کی طرف سے پنجاب کے گورنر کے عہدے پر فائز تھے۔ اس خط میں احمد لاہوری کو شاہجہانی دور کے ایک نہایت ہی تجربہ کار اور بے مثال معمار کے طور پر پیش کیا گیا تھا اور گورنر کو حکم دیا گیا تھا کہ چونکہ احمد لاہوری کو شمالی ہندوستان میں مختلف تعمیراتی پروجیکٹ کی نظارت کے سلسلے سے متواتر سفر کرنا پڑتا ہے اس لیے اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ صوبہ پنجاب میں اس شاہی معمار کو کسی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے سید سلیمان ندوی نے دیوان مہندس میں موجود اطلاعات کی روشنی میں احمد لاہوری اور اس کے خاندان پر ایک مبسوط مضمون لکھا اور اس میں ڈاکٹر چغتائی سے موصول معلومات کا حوالہ بھی دیا۔ سید سلیمان ندوی نے یہ مضمون 9 مارچ 1933ء کو ادارہ معارف اسلامیہ کے پہلے جلسے میں لاہور میں پڑھا۔ بعد میں یہ مضمون 1936 سے 1939 کے درمیان معارف کے پے در پے شماروں میں قسط وار شائع ہوا اور 1948 میں صباح الدین عبدالرحمن نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

اس مضمون کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

1. احمد لاہوری کا خاندان بابر کے زمانے میں ایشیائے مرکزی سے ہجرت کر کے لاہور میں آباد ہو گیا تھا۔

2. احمد لاہوری، عصری علوم، خاص طور سے علم ریاضی، علم ہندسہ، نجوم، وہئیت اور فلسفہ میں اعلی درجے پر فائز ہونے کی وجہ سے اپنے ہمعصروں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔

3. احمد لاہوری تاج محل اور لال قلعہ دہلی کے معمار اصلی تھے۔

4. احمد لاہوری کے تین بیٹے عطاء اللہ رشید، لطف اللہ مہندس اور نوراللہ معمار بھی اپنے زمانے کے مشہور دانشمند اور فن تعمیر میں یکتائے روزگار تھے۔

پروفیسر نذیر احمد نے احمد معمار کے عنوان سے اپنے مبسوط مضمون میں پہلے سے دریافت شدہ حقائق پر خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ مقالے کی ابتدا میں انہوں نے ڈاکٹر محمد عبد اللہ چغتائی کے اس نظریے کی تردید کی ہے جہاں انہوں نے احمد لاہوری کو تاج محل کا معمار ماننے سے یہ کہہ کر انکار کیا ہے کہ کیونکہ یہ ابیات صرف دیوان مہندس کے ایک ہی نسخے میں موجود ہیں اسلیے قابل قبول نہیں ہیں۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر عبداللہ نے جن تین قلمی نسخوں سے استفادہ کیا ہے وہ تینوں میری نظر سے گذرے ہیں اور ناقص ہیں اسلیے ان کا بیان مورد اعتناء نہیں ہے۔

پروفیسر نذیر احمد صاحب نے اپنے مقالے میں پہلی بار اکثر محققین سے اختلاف نظر کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ احمد لاہوری کا خاندان ایشیائے مرکزی سے نہیں بلکہ ہرات سے ہجرت کر کے لاہور آیا تھا۔ اس کی دلیل میں انہوں نے مؤلف تذکرہ باغستان امام الدین ریاضی کی یہ عبارت نقل کی ہے:

الہروی ثم لاہوری ثم الدہلوی

نذیر احمد صاحب نے احمد لاہوری کو شاہجہاں کی طرف سے ملنے والے خطاب نادر العصر کے حوالے سے بھی پہلی بار یہ انکشاف کیا کہ لطف اللہ مہندس کے زیر قرأت قرآن کے حاشیے پر یہ تحریر موجود ہے کہ شاہجہاں نے بے مثال اور متنوع صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے احمد لاہوری کو اس خطاب سے سرفراز کیا۔ نذیر احمد صاحب نے تذکرہ باغستان کی بنیاد پر استاد احمد کا شجرہ بھی تیار کیا ہے اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ان کے خاندان کے لوگ ابھی بھی موجود ہیں۔ استاد نذیر احمد صاحب نے اپنے مقالے میں بعض ایسی الحاقی کتابوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن کو بعض محققین اور فہرست نگاروں نے اشتباہاً استاد لاہوری سے منسوب کر دیا تھا۔

خلاصہ یہ کہ اس مقالے میں پروفیسر نذیر احمد صاحب نے استاد احمد لاہوری اور ان کے خاندان کے متعلق بعض ایسے گوشوں سے پردہ اُٹھایا ہے جو انہیں کا خاصہ تھا اور شاید یہ کسی اور کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔

تذکرہ باغستان

تذکرہ باغستان، امام الدین حسین ریاضی کا تذکرہ ہے جو کہ معمار تاج محل نادر العصر استاد احمد معمار کے پوتے تھے یہ تذکرہ 1704-1708ء کے درمیان تالیف ہوا۔ استاد احمد معمار سے متعلق تحقیقات کے باب میں تذکرہ باغستان کا کشف پروفیسر نذیر احمد کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ ''تذکرہ باغستان'' کا ایک حصہ ٹیگور لائبریری لکھنوء اور ایک حصہ رامپور رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔ ٹیگور لائبریری والے حصہ سے متعلق اردو ادب 1955، اسلامک کلچر 1956-57 میں شائع مقالات کے ذریعے نذیر صاحب اس تک پہنچ سکے لیکن رامپور والا حصہ خود ان کی تحقیق ہے۔ باغستان، مجموعاً بارہ ابواب پر مشتمل ہے- جو کہ باغ کے عنوان کے حامل ہیں اور ذیلی ابواب کو چمن کا نام دیا گیا ہے مخطوطہ کے پہلے حصے میں پانچ باغ اور دوسرے حصے میں باقی کے 7 باغ ہیں۔

پروفیسر نذیر احمد نے مخطوطے کے دونوں حصوں کی بے ترتیبی کے باجود بڑی محنت سے ابواب کے عناوین اور ان کے مطالب کا تعارف پیش کیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے دونوں حصوں کے مطالعہ کے نتیجہ میں امام الدین ریاضی کے تذکرہ باغستان کے منابع و مصادر کی فہرست بھی مرتب کی ہے جو کم وبیش 80 کتابوں پر مشتمل ہے- تذکرہ باغستان جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا 12 ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب ایک مخصوص موضوع کا حامل ہے- ان ابواب میں دو باب خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ چھٹا باغ جو کہ مختلف صوفی سلسلوں کے بیان اور صوفیاء کے مختصر اور مفصّل شرح حال پر مشتمل ہے اور نواں باب جو کہ شاہجہاں اور اورنگزیب کے زمانے کے شاعروں کا تذکرہ ہے- صوفی سلسلوں کے باب میں سلسلہ قادریہ چشتیہ، نقشبندیہ، اور شطّاری سلسلوں کا مفصّل طور پر ذکر کیا گیا ہے- ان میں بھی سلسلہ قادریہ بیشتر تفصیل اور توجہ سے لکھا گیا ہے۔ ممکن ہے امام الدین ریاضی کا رجحان سلسلہ قادریہ کی طرف رہا ہو۔ اس کے علاوہ متفرق صوفیا کے ذیلی عنوان کے تحت بعض مشہور صوفیا کا ذکر کیا گیا ہے جن میں شیخ ابوسعید ابوالخیر، ابراہیم ادہم، شیخ محب اللہ الہ آبادی، بوعلی شاہ قلندر وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اس باب میں خواتین صوفیوں کے ذیل میں فاطمہ بن ابوعلی دقاق اور رابعہ بصری کا ذکر ہے۔

نواں باب جوکہ شاعروں کا تذکرہ ہے چار چمن پر مشتمل ہے۔ پہلا چمن دو نہروں میں منقسم ہے۔ پہلی نہر میں عربی اور دوسری نہر میں ترکی شاعروں کا ذکر ہے۔ دوسرا چمن فارسی کے 43 ابتدائی شعرا کے ذکر پر مشتمل ہے۔ تیسرا چمن عہد وسطیٰ کے 19 شعرا کے احوال کو محیط ہے۔ چوتھا چمن پہلے چمن کی طرح دو نہروں میں منقسم ہے۔ پہلا نہر 28 جدید شاعروں کا احوال ہے۔ دوسرا نہر دو سفینوں پر مشتمل ہے۔ پہلا سفینہ ان معاصر شعرا کے ذکر پر محیط ہے جو ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور دوسرا سفینہ ہندوستان کے معاصر فارسی شاعروں کا احوال ہے۔ یہاں دو باتیں قابل ذکر ہیں۔ اول یہ کہ نذیر صاحب نے جس طرح باغستان کے منابع اور مصادر کی فہرست مرتب کی اور صوفیا کے باب میں مذکورہ صوفیا کے نام درج کیے، اگر شاعروں کی فہرست بھی شامل ہوتی تو مقالہ سے ادبی نقطہ نظر سے استفادہ کے امکانات چند برابر ہو جاتے۔ دوسری بات یہ کہ استاد احمد گلچین معانی اپنے مشہور تذکرہ کاروان ہند میں جو کہ جہان فارسی سے ہندوستان مہاجرت کرنے والے شعرا کا دو جلدوں پر مشتمل ایک ضخیم تذکرہ ہے، کہتے ہیں کہ اس موضوع پر سب سے پہلی کاوش محمی نراین شفیق کا تذکرہ شام غریباں ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ باغستان میں اس موضوع پر ایک الگ باب قائم کیا گیا ہے۔ یہ نقطہ اس تذکرہ کی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔

اسی مقالہ میں پروفیسر نذیر احمد، مشہور چشتی بزرگ شاہ کلیم اللہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگرچہ اکثر محققین نے نوراللہ کو شاہ کلیم اللہ کا والد بتایا ہے لیکن پہلی بار پروفیسر خلیق احمد نظامی نے واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ شاہ کلیم اللہ کے والد کے طور پر جانے جانے والے نوراللہ دراصل احمد ہروی کے بیٹے نوراللہ معمار ہیں لیکن انہوں نے اس بات کیلئے کوئی سند پیش نہیں کی ہے۔ پروفیسر نذیر احمد نے پہلی بار اپنے وسیع مطالعہ اور نکتہ سنجی کی بنیاد پر کلیم اللہ کے ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے اس نظریہ کو مستند بنایا ہے۔ کلیم اللہ نے اپنے ایک خط میں امام الدین کو اپنا چچازاد بھائی بتایا ہے جس سے یہ بات پایہ اثبات کو پہونچتی ہے کہ شاہ کلیم اللہ مشہور صوفی بزرگ، احمد لاہوری کے پوتے ہیں۔ نذیر احمد صاحب نے اس بیان کو مزید مستند بنانے کیلئے دوسرا حوالہ آزاد بلگرامی کے تذکرے مآثر الکرام کا دیا ہے جس میں وہ کلیم اللہ کے احوال کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ شاہ کلیم کے دادا فن تعمیر کے ماہر تھے لیکن خدا نے ان کو قلوب انسانی کی تعمیر کی صفت سے نوازا ہے۔

پروفیسر صاحب کے مذکورہ بالا دلائل نے پہلی بار اس بیان کو سند یت بخشی کہ مشہور چشتی صوفی شاہ کلیم اللہ، احمد لاہوری، معمار تاج محل کے پوتے ہیں۔ باغستان میں استاد احمد معمار سے متعلق زیادہ اطلاعات نہیں ہیں۔ البتہ ان کے بیٹوں سے متعلق بعض اہم اطلاعات جو نذیر صاحب نے فراہم کی ہیں ذیل میں اختصاراً پیش کی جاتی ہیں:

استاد احمد معمار کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑے بیٹے کا نام عطاء اللہ رشیدی تھا۔ رشیدی ریاضی اور متعلقہ علوم میں مہارت کامل اور شعر و شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے اور اپنے چھوٹے بھائی لطف اللہ مہندس (ریاضی کے والد) کے استاد بھی تھے۔ ان کی تین کتابیں ملتی ہیں: بیج گنت، خلاصہ راز اور خزائن الاعداد- یہ تینوں کتابیں ریاضی سے متعلق ہیں۔

پروفیسر نذیر احمد نے ان تینوں کتابوں کو مختلف فہرستوں میں تلاش کرنے کے بعد ان کے مختلف مراجع کا بھی ذکر کیا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ رشیدی، اورنگزیب کی بیگم ملکہ رابعہ درّانی کے مزار کے معمار تھے جو کہ اورنگ آباد میں 1650ء میں بنایا گیا۔ باغستان میں رشیدی کا ذکر تین مقامات پر آیا ہے۔ لطف اللہ مہندس (والد ریاضی)، استاد احمد معمار کے دوسرے بیٹے کے باب میں نذیر احمد صاحب نے سید سلیمان ندوی کی تحقیقات پر تکیہ کرتے ہوئے ان کی کتابوں کی مکمل فہرست اپنے مقالے میں درج کی ہے لیکن انہوں نے باغستان کے مطالعہ سے لطف اللہ مہندس کی دو اور کتابوں، شرح تہذیب اور تذکرہ علمائے مہندسی، کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہاں ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ سید سلیمان ندوی نے رسالہ بیان کو کہ جو بلاغت کے موضوع پر ہے مہندس کے آثار میں شمار کیا ہے۔ لیکن نذیر احمد صاحب نے یہ بتایا ہے کہ یہ رسالہ دراصل امام الدین ریاضی کی تصنیف ہے نہ کہ مہندس کی۔ نورالدین معمار رشیدی، استاد احمد معمار کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے اور فن معماری، ریاضی و متعلقہ علوم کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ خوشنویس بھی تھے اور مہندس کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہفت قلم بھی تھے:

گنج ہنر آمدہ در مشت او ہفت
قلم راندہ سہ انگشت او

خود امام الدین ریاضی کے احوال و آثار سے متعلق باغستان ایک اہم منبع ہے اور پروفیسر نذیر احمد نے اس کے مطالعہ سے ریاضی کے آثار کی مکمل فہرست فراہم کی ہے۔ اسی طرح ریاضی کے چھوٹے بھائی میرزا ابوالخیر معروف بہ خیراللہ سے متعلق بھی اہم اطلاعات اس کتاب میں موجود ہیں۔ نذیر صاحب نے ان کی تالیفات کی فہرست آمادہ کی ہے اور یہ بھی نشاندہی کی ہے کہ ان کے نسخے کہاں کہاں موجود ہیں۔

امام الدین ریاضی صاحب دیوان شاعر بھی تھا۔ اس نے 1704ء سے قبل اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا لیکن وہ دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔ سفینہ خوشگو، تذکرہ ہمیشہ بہار، صحف ابراہیم، مخزن الغرائب وغیرہ میں اس کی شاعرانہ شخصیت سے متعلق اطلاعات ملتی ہیں۔ باغستان کے مطالعہ سے نذیر احمد صاحب نے ریاضی کی بعض غزلوں کو جو کہ صائب، طالب، ظہوری وغیرہ کے جواب میں ہیں اپنے مقالہ میں درج کیا ہے جس سے ریاضی کی شاعرانہ قابلیت پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ پروفیسر نذیر احمد نے استاد احمد معمار اور ان کے خاندان سے متعلق جو اطلاعات بہم پہنچائی ہیں وہ یقیناً اس باب میں اہم اضافہ ہیں۔ بالخصوص تذکرہ باغستان کا انکشاف اور اس کے مطالعے کے نتیجے میں بہت سی اطلاعات پہلی مرتبہ ہم تک پہنچ سکیں اور کئی باتوں کی تصحیح ہو سکی۔ تاہم، تذکرہ باغستان، جیسے متنوع مطالب کے تذکرہ میں اور بھی بہت سی اہم تاریخی اور ادبی اطلاعات موجود ہیں لیکن بہرحال چوں کہ استاد نذیر احمد کا ہدف خانوادہ احمد معمار سے متعلق اطلاعات کی فراہمی تھا لہذا وہ اسی پر متمرکز رہے اور اس نابغہ روزگار سے متعلق اطلاعات کی تحقیق کی جو بجائے خود ایک معرکہ آرا کام ہے جس سے علمی حلقہ ہمیشہ مستفید ہوتا رہے گا۔

مصادر:

اخلاص شاہجہان آبادی، کشن چند، ہمیشہ بہار، بہ تصحیح ڈاکٹر وحید قریشی، انجمن ترقی اردو، کراچی، 1973ء

خوشگو، بندرابن داس، سفینہ خوشگو، بہ اہتمام سید شاہ محمد عطاء الرحمان کاکوی، سلسلہ انتشارات ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنا، 1959ء

ریاضی، امام الدین حسین، تذکرہ باغستان مخطوطہ، ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ۔

شفیق اورنگ آبادی، منشی محمی نارائن، تذکرہ شام غریباں، ترتیب محمد اکبر الدین صدیقی، کراچی، 1977ء

معانی، احمد گلچین، کاروان ہند، مؤسسہ چاپ و انتشارات آستان قدس رضوی، مشہد، دو جلد، چاپ اول 1369

ہاشمی سندیلوی، شیخ احمد علی خان، مخزن الغرائب، مخطوطہ 1120، حبیب گنج کلکشن، مولانا آزاد لائبریری، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ۔

آزاد بلگرامی، میر غلام علی، خزانہ عامرہ، مطبع نولکشور، کانپور 1873ء

آزاد بلگرامی، میر غلام علی، مآثر الکرام بہ تصحیح عبداللہ خان، بہ اہتمام مولوی عبدالحق، کتابخانہ آصفیہ، حیدرآباد، 1913ء

❑❑❑

محمد شاہد ساز

جودھن سنگھ روڈ، پی رشرا ہُگلی

7980672722

تذکرہ

شمس النساء بیگم کا دیوان

نام نواب شمس النساء بیگم، تخلص شرمؔ تھا۔ والد کا نام حکیم قمر الدین خاں تھا اور شاعری میں خواجہ وزیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ بنارس میں سکونت پذیر تھے۔ مخمور بنارسی، قمر الدین خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''..... اسم شریف آں سینائے ثانی جالینوس زمانی حکیم محمد قمر الدین علی خاں از سکنائے دارالامارہ لکھنو بود اقلیدس فطرت ارسطو طبیعت وارد دیدہ بنارس گشتہ و بدل ذوق ایں فن شریف داست نثر نیز مربوط می نگاشت ایں غزل آں مرحوم است۔''

کھلتے ہوں غم ہجراں سے جس کے خار پہلو میں
کہو کیوں کر نہ ہو اس کا دل افگار پہلو میں
کروں سو بار صدقے دل کو اس کی بدگمانی پر
اگر وہ آن کر بیٹھے پھر سے ایک بار پہلو میں

(تذکرہ مداح الشعراء، نواب عنایت حسین خاں مہجور بنارسی، مرتب افسر صدیقی۔ ۱۹۷۶ء، ص: ۳۳)

مولوی عبدالحئی صفا نے ''تذکرہ شمیم سخن'' میں شرمؔ کے متعلق تحریر فرمایا ہے:

''..... شرم تخلص شمس النساء بیگم بنت حکیم قمر الدین شاگرد خواجہ وزیر لکھنوی وطن اصلی وطن بنارس و مسکن لکھنؤ تھا۔''

(تذکرہ شمیم سخن، مولوی عبدالحئی صفا، ۱۸۹۱ء، ص: ۳۱)

تذکرہ ''بہارستان ناز'' میں حکیم فصیح الدین رنج نے شرمؔ کا تذکرہ یوں کیا ہے:

''..... شرم تخلص، نواب شمس النساء بیگم نام بنت حکیم قمر الدین شاگرد خواجہ وزیر لکھنوی، مولدان کا بنارس ہے، مسکن لکھنؤ ہے، صاحب عصمت وحیا، نہایت عقیل اور ذہین ذکا ہے۔ عروض وقوافی میں استعداد معقول ہے۔ فن شاعری جیسا چاہیے حصول ہے۔''

(تذکرہ بہارستان ناز، حکیم فصیح الدین مرتب خلیل الرحمٰن داوری، ۱۹۶۵ء، ص:)

ثمینہ فاروقی، شرمؔ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''..... نام شمس النساء بیگم، تخلص شرمؔ بنارس کی معروف شخصیت حکیم قمر الدین کے گھر بنارس میں پیدا ہوئیں۔ حکیم قمر الدین خان اچھے شاعر اور خواجہ وزیر کے تلامذہ میں تھے۔ خاندانی و وطنی ماحول نے شعر و شاعری کی طرف مائل کیا اور وہ شاعری کرنے لگیں۔ انہوں نے بنارس سے لکھنؤ منتقل ہو کر لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ کلام اچھا ہے لیکن عریانی جگہ جگہ جھلکتی ہے۔''

(تذکرہ شاعرات لکھنؤ، ثمینہ فاروقی، ۲۰۰۹ء، ص: ۱۴۶)

شاعرات کے دیگر تذکرے ''تذکرۂ انسوان ہند'' (فصیح الدین بلخی)، ''تذکرۂ سراپا سخن'' (محسن علی محسن) ''شاعرات اردو'' (جمیل اردو) ''شاعرات کا تذکرہ'' (نسیمہ دہلوی) اور ''نشاط افزا'' (حکیم چرن داس) وغیرہ میں یہی تحریر درج ہے کہ نام شمس النساء بیگم اور تخلص شرمؔ تھا۔ حکیم قمر الدین خاں کی بیٹی تھیں اور خواجہ وزیر لکھنوی کی شاگرد تھیں۔

''شمس النساء بیگم شرمؔ کا تعلق کانپور سے تھا۔ وہ اپنے زمانے کی ایک قابل قدر شاعرہ تھیں۔ انہوں نے خواجہ محمد وزیر کی شاگردی اختیار کی تھی۔ شمس النساء کی شہرت کا سبب ان کا دیوان ''عروس مضمون'' (معروف بہ دیوان شرم) ہے۔ شرم کا دیوان دو مرتبہ شائع ہوا۔ پہلی مرتبہ ۱۲۷۲ھ میں مطبع آصفی، کانپور سے بہ اہتمام بینی پرشاد اور دوسری مرتبہ ۱۲۹۰ھ میں مطبع گلشن محمدی سے بہ اہتمام مصاحب علی نوارانی شائع ہوا۔ شرم کے دیوان کی تقریظ سید محمد ہادی علی بیخودؔ نے لکھی ہے۔ جس میں شرم کی بے باکی اور اظہار خیال کی جرأت کی حوصلہ افزائی کی۔

حکیم قمر الدین خاں خود شاعر تھے اور خواجہ وزیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ شمس النساء بیگم بھی خواجہ وزیر لکھنوی سے اصلاح لیتی تھیں۔ ''دیوان شمس'' میں شمس النساء بیگم کے بارے میں یہ تحریر ملاحظہ فرمائیں:

''..... معظمہ و محترمہ شمس النساء بیگم صاحبہ لازالت شموش اتبالہا الی یوم القیامہ المتخلص بہ شرم نی یرنگ طاعی اور جو ہر بانی سی رنگ تازہ جمایا یعنی ایک دیوان فصاحت عنوان زبان اردو لکھنو میں موزوں فرمایا اور نظر فیض اثر سرخیل سخنوران جہان اوستاد شعری عالی طحان محسو و برتاؤ پر جناب غفران مآب خواجہ وزیر مرحوم وزیر تخلص میں گزرانا جناب مغفور نی بموجب کلام الملک ملک الکلام کمال حسن نزاکت اور لطافت میں بقدر ضرورت تعرف کیا۔ بیشتر غزلوں کو انتہائی خوبصورتی سے بدستور رہنے دیا۔''

(عروس مضمون، ۱۲۷۲ ہجری، ص؛ ۲)

شمس النساء بیگم شرم کا انتقال کب اور کہاں ہوا، اس کے بارے میں کوئی معلومات فراہم نہیں ہوئی ہے۔ رفیعہ سلطانہ نے اپنی کتاب ''اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ'' میں لکھا ہے:

''..... تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ شمس النساء بیگم خواجہ وزیر کی تلمذ تھیں۔ انہوں نے ایک دیوان ''عروس مضمون'' اپنی یادگار چھوڑا، ۱۹۰۲ء تک بقید حیات تھیں۔''

(اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ، رضیہ سلطانہ، ص: ۹۰)

شمس النساء بیگم شرم کا تعلق کانپور سے تھا۔ وہ اپنے زمانے کی ایک قابل قدر شاعرہ تھیں۔ انہوں نے خواجہ محمد وزیر کی شاگردی اختیار کی تھی۔ شمس النساء کی شہرت کا سبب ان کا دیوان ''عروس مضمون'' (معروف بہ دیوان شرم) ہے۔ شرم کا دیوان دو مرتبہ شائع ہوا۔ پہلی مرتبہ ۱۲۷۲ھ میں مطبع آصفی، کانپور سے بہ اہتمام بینی پرشاد اور دوسری مرتبہ ۱۲۹۰ھ میں مطبع گلشن محمدی سے بہ اہتمام مصاحب علی نوارانی شائع ہوا۔ شرم کے دیوان کی تقریظ سید محمد ہادی علی بیخود نے لکھی ہے۔ جس میں شرم کی بے باکی اور اظہار خیال کی جرأت کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ:

''.....مردوں میں تو بہت لوگوں نے اقلیم سخن کو سر کیا، سکہ بٹھایا مگر مستورات میں ہمت مردانہ سے معدودہ چندنے در پردہ جو ہر طباعی دکھایا۔ اوران میں سے ایک آدھ سو وہ بھی زبان غیر میں مخفی بر آوردہ نام ہو گئے صاحب دیوان ہو کر مشہور خاص وعام ہو گئے جب سے پھر کسی کا رنگ نہ جما۔ اس فرقے میں کوئی عالی طبع ایسا نہ ہوا کہ تیغ زبان سے جواب دیتا۔ اور بزور شمشیر کلام اقلیم سخنوری کو چھین لیتا۔ بعد ویرانی دہلی اختر نگر اودھ کا ستارہ اوج پر آیا۔ یہ سرزمین نزہت آئین مردم خیز کمالات انگیز ہوئی۔ قدر شناسی روسائے وقت سے ہر اہل کمال نے نشو ونما خاطر خواہ پایا۔ بمقتضائے فضلنا بعضکم علی بعض اس دور آخر میں حق تعالیٰ نے تماشا قدرت کا دکھایا یعنی بلقیس چشم زہرہ قدم سرخیل اہل عفت مریم عصمت زیب النسائی دوراں، فخر بیگمات ہندوستان، جناب قدسی مآب معظمہ و محترمہ شمش النساء بیگم صاحبہ لازالت شموش اقبالہا الی یوم القیامہ المتخلص بہ شرم نے نیرنگ طباعی اور جوہر باطنی سے رنگ تازہ جمایا یعنی ایک دیوان فصاحت عنوان زبان اردوئے لکھنؤ میں موزوں فرمایا اور نظر فیض اثر سرخیل سخنوران جہان استاد شعرائے عالی طبعان محسود برناؤ پیر جناب غفران مآب خواجہ محمد وزیر مرحوم وزیر تخلص میں گذرانا۔ جناب مغفور نے بموجب کلام الملک ملک الکلام کمال حسن نزاکت اور لطافت سے بقدر ضرورت تصرف کیا۔ بیشتر غزلوں کو انتہائی خوبی سے بدستور رہنے دیا، سکہ ہائے طبع تفاوتو کو کامل العیار جانا۔ حق یہ ہے کہ کمال خداداد ہے۔ کچھ کسی پر خصوصیت نہیں ہر شخص کی یکساں طبیعت نہیں، بڑوں کی بڑی بات ہے سبحان اللہ!''

(عروس مضمون۔ص: ۲۔ ۳)

عروس مضمون یا دیوان شرم میں شامل ردیف وار غزلوں کی تعداد درج کی جاتی ہے:

ردیف الف.....	۳۴
ردیف ب.....	۳
ردیف پ.....	۲
ردیف ت.....	۶
ردیف ث.....	۴
ردیف ج.....	۱
ردیف چ.....	۱
ردیف ح.....	۱
ردیف خ.....	۱
ادیف د.....	۵
ردیف ذ.....	۱
ردیف ر.....	۳
ردیف ز.....	۱
ردیف س.....	۳
ردیف ش.....	۱
ردیف ص.....	۱
ردیف ض.....	۲
ردیف ط.....	۱
ردیف ظ.....	۱
ردیف ع.....	۲
ردیف غ.....	۲
ردیف ف.....	۱
ردیف ق.....	۱
ردیف گ.....	۲
ردیف ل.....	۵
ردیف م.....	۴
ردیف ن.....	۱۱
ردیف و.....	۱۶
ردیف ہ.....	۲

اس طرح ''دیوان شرمؔ'' میں ردیف وار کل ۱۴۶ رغزلیں ہیں۔غزلوں کے بعد دو قصیدے اور ایک مطلع بھی درج ملتا ہے۔دیوان کی ابتدا مندرجہ ذیل حمد سے ہوتی ہے:

مقر ہوں روز ازل سے میں تیری وحدت کا
نہ کیوں ہو ورد مجھے کلمۂ شہادت کا
ادا ہوا نہیں کچھ حق جو ہے عبادت کا
فقط ہمیں تو وسیلہ ہے تیری رحمت کا
محبت آل عبا کی ملی ہے دنیا میں
میں کس زباں سے کروں شکر تیری نعمت کا
کیوں نہ ہو شمس و قمر ان کے تصدق اے شرمؔ
نور حق سے ہوئے ہیں احمد و حیدر پیدا

عقیدت کا یہ رنگ دیوان کی تمام غزلوں میں موجود ہے۔حمد و نعت کے بعد سلسلہ وار غزلیں مل جاتی ہیں جن میں کلاسیکی رنگ رچا بسا نظر آتا ہے۔اس دیوان کی خاصیت صرف کلاسیکیت نہیں بلکہ انداز بیان کی تر و تازگی بھی ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے،اور قاری کو ایک کیف پرور ماحول سے لطف اندوز کرتی ہے۔

''عروس مضمون'' کے آخر میں میر صاحب عشقی کا قطعۂ تاریخ یوں درج ہے:

کیا عمدہ چھپا ہے واہ دیوان
ہر اہل سخن کی جاں فدا ہے
عشقی دل جان ہی ہے یہ تاریخ
زیبا یہ نظم دلربا ہے
۱۲۷۸ھ

''دیوان شرمؔ'' نسائیت سے پُر شاعری کا ایک کامیاب نمونہ ہے،جس میں ایک عورت کی محبت کا اظہار بڑی ہی بے باکی سے ملتا ہے۔شرمؔ عاشق ہے۔اور اپنے محبوب کے حسن و جمال،اس کے سراپا،اس کی رفتار،اس کے انداز،اس کی نظروں کے وار،غرض کہ محبوب کی ہر ہر ادا پر جاں نثاری کرتی نظر آتی ہے۔وہ اپنے محبوب کے ہرجائی پن کی شکایت بھی کرتی ہے۔اور اس کے غم میں تڑپتی بھی ہے۔اسے محبوب کی شوخیاں پسند ہیں۔وہ اس کے ظلم و ستم کو بھی برداشت کرتی ہے اور ہجر کی مشکلوں میں بھی وصل کی امید و خواہش رکھتی ہے۔

اس سلسلے میں حسب ذیل اشعار ملاحظہ کریں:

محفل خوباں میں جب آتا ہے وہ رشک پری
پھر بھلی لگتی نہیں آنکھوں میں صورت حور کی
(محبوب کی تعریف)

یوں ہے قریب روئے منور کے زلف یار
ابر سیاہ چاند کے جس طرح پاس ہو
(محبوب کے حسن و جمال کا ذکر)

اس کی قامت کو بھلا کیوں نہ قیامت کہیے
چال سے جس کے ہوا فتنۂ محشر پیدا
(محبوب کے قد و قامت کی ستائش)

اللہ رے نازکی مرے اس مست ناز کی
اٹھتا نہیں ہے ہاتھ سے ساغر شراب کا

شرمؔ کے یہاں عاشق و معشوق کے درمیان سوال و جواب کا خوبصورت انداز بھی ملتا ہے:

کہا میں نے کہ دے اک بوسۂ زلف
لگا کہنے تجھے میری بلا دے
پوچھا جو میں نے اسم خفا ہو کے یوں کہا
کیوں پوچھتے ہو کیا ہے میرے نام سے غرض

شاعرہ نے بوسے کے مضمون کو اس خوبصورتی سے باندھا ہے کہ شعری لطف پیدا ہو گیا ہے۔عشق کی پاکیزگی اور اس کی ستھرے جذبات کا اظہار بھی صاف صاف ہو رہا ہے۔یہی وہ خوبی ہے جس سے شرمؔ کے ہاں رکاکت پیدا نہیں ہو پاتی۔بلکہ کلام شرمؔ کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں ایک عورت کے محبت بھرے جذبات کا بیان موجود ہے۔

شرمؔ کے بیشتر اشعار میں محبوب کی ستائش اس انداز میں ملتی ہے کہ حقیقی و مجازی معنوں میں بہت کم فرق رہ جاتا ہے:

جس وقت ذوالجناح پہ حضرت ہوئے سوار
بوسہ لیا فرشتوں نے آکر رکاب کا
پیش نظر ہے مصحف عارض جناب کا
ہر دم مطالعہ ہے خدا کی کتاب کا

شرمؔ کے کئی اشعار میں مبالغہ بھی موجود ہے:

خوشبو کا جس کے یار کی کیا کیجیے بیاں
بن جائے جس کے غسل سے دریا گلاب کا
نظر آجاتی ابھی برق تجلی اے شرمؔ
غسل کرنے کے لیے شوخ جو عریاں ہوتا

محبوب کے جسم کی خوشبو سے غسل کے دوران گلاب کا دریا بننا۔غسل کرنے کے لیے محبوب کے عریاں ہونے سے برق تجلی کا نظر آنا،مبالغے کی بہترین مثالیں ہیں۔

اسی طرح شرمؔ کے ہاں خوبصورت تشبیہ بھی مل جاتی ہے:

زلف اغیار کو اے شرمؔ جو دکھلاتا یار
گل و سنبل کو مری طرح سے سودا ہوتا
گلشن دہر میں نالے کیے بلبل کی طرح
مے گل رنگ جو ساقی نے پلانا چھوڑا

غرض کہ نسائی جذبات کی ترجمانی کی ایک خوبصورت مثال ''عروس مضمون'' معروف بہ ''دیوان شرمؔ'' ہے۔جس کے ہر ہر شعر سے محبت کی رنگینی،خلوص و وفا اور مہر و محبت کی داستان مل جاتی ہے۔یہ دیوان عقیدت و محبت کا ایک بہترین مجموعہ ہے۔

❑❑❑

غزل

کسی کی رات کو روشن بنا بھی سکتے ہیں
دِیے مکان کسی کا جلا بھی سکتے ہیں

ابھی خرید سکو تو خرید لو ہم کو
ہم اپنا دام کسی دن بڑھا بھی سکتے ہیں

ہیں منتظر کہ وہ اک شخص پوچھنے آئے
ہم اپنی وجہِ تباہی بتا بھی سکتے ہیں

تمہیں پکار کے دیکھا ہے تم نہیں آئے
ہمیں پکار کے دیکھو ہم آ بھی سکتے ہیں

جو ہنس رہے ہیں وہ خوش بھی ہوں کیا ضروری ہے
لبوں پہ جھوٹی ہنسی وہ سجا بھی سکتے ہیں

تنگ آچکے ہیں لگاتار خشت باری سے
یہ آئینے کبھی پتھر چلا بھی سکتے ہیں

خموش بیٹھے ہیں مردہ نہیں ہوئے ہیں ابھی
پرندے پنکھ کبھی پھڑپھڑا بھی سکتے ہیں

احمد کمال حشمی
کانکی نارہ، مغربی بنگال
9433145485

غزل

زمین و آسماں کیا چیز ہے یہ جان لیتے ہیں
بصیرت کی نظر پڑتے ہی سب پہچان لیتے ہیں

ادب کے ساتھ رہنا مصلحت سے کام کر لینا
بزرگوں نے یہ فرمایا ہے اس کو مان لیتے ہیں

یہ سچی بات ہے دنیا انھیں اچھی نہیں لگتی
جو دنیا کی حقیقت کو ذرا پہچان لیتے ہیں

زمانے کی قسم کھا کر بتایا ہے ہمیں سب کچھ
کہاں اس سے سبق اب حضرت انسان لیتے ہیں

یہ دنیا اپنی فطرت اور قائم ہے اصولوں پر
اسی سے زندگی کے ہم بھی کچھ سامان لیتے ہیں

زیادہ بولنا کم سننا اور ضد پر اڑے رہنا
حماقت کے کھلونوں کو فقط نادان لیتے ہیں

ہم اپنے درد کی تسکین کے کچھ راز بتلادیں
ہر اک مشکل میں رضواں رب کا ہم فرمان لیتے ہیں

ڈاکٹر رضوان الرضا، رضوان
پروفیسر حیات یونانی کالج لکھنؤ
8787008995

غزل

آج تو میں بھی قسم دھوپ کی کھا کے آئی
سرد موسم کو کئی بات سنا کے آئی

کوئی سایہ سا مرے ساتھ چلا آتا ہے
جب بھی مَیں دشت میں آواز لگا کے آئی

اس نے دعوے ہی کیے ایسے کہ مجبوری میں
روبرو چاند کے مَیں مِقنع اٹھا کے آئی

ہم کنیزوں کو بہت سہل سمجھتا تھا وہ
شاہزادے کو میں اوقات دکھا کے آئی

جانے کس سمت سے وہ شخص یہاں آجائے
میں تو ہر موڑ پہ اک دیپ جلا کے آئی

سارے حیراں تھے مگر میں تو اجالوں کی فصل
غیرمزروعہ زمیں پر بھی اُگا کے آئی

شازیہؔ در پہ ہی سورج کو بٹھائے رکھنا
میں ذرا چاند کو کمرے میں سلا کے آئی

شازیہ نیازی
عالم نگر، برن پور، آسنسول، مغربی بنگال
8250564231

غزل

مجھ کو ہر ذرے کے سینے میں اتر جانے دے
میں ترے حسن کی خوشبو ہوں بکھر جانے دے

آزما مجھ کو نہ تو رکھ کے مقابل شمع
تیرا پروانہ ہوں مجھ کو نہ ادھر جانے دے

سر پہ چڑھ جاتے ہیں کچھ لوگ پکڑ کر انگلی
اپنے کاندھوں سے کسی کو نہ ابھر جانے دے

آگیا میرے شبستاں میں کوئی رات گئے
دور تک جتنی یہ جاتی ہے خبر جانے دے

اک تماشا نہ بنا کر کے دِوانہ مجھ کو
چین سے جینے دے یا پھر مجھے مر جانے دے

چھوڑ دزدیدہ نگاہی سے تغافل کا چلن
اپنی بس ایک نظر مجھ پہ ٹھہر جانے دے

لوگ چڑھتے ہوئے سورج کو صدا پوجتے ہیں
گرمیٔ وقت کا پارہ ہے اتر جانے دے

سید اسلم صدا آمری چینائی
غلام محی الدین اسٹریٹ سکینڈ فلور، انا سلائی، چنئی
9444752605

رینو بہل

سیکٹر ۴۹ بی، چنڈی گڑھ

9781557700

’خدا گواہ رہے گا‘

افسانہ

ہر لڑکی کا پہلا پیار اُس کا باپ ہوتا ہے۔ بے شک وہ اپنے باپ کا ہاتھ کچھ سالوں تک تھام کر پرائے گھر چلی جاتی ہے مگر تا عمر اُس کے دل پر باپ کی محبت قابض رہتی ہے۔ ایسی لاکھوں کروڑوں بیٹیوں میں سے میں بھی ایک ہوں۔ شاید ہر بیٹی میری طرح یہ ہی سمجھتی ہے کہ میرے بابا دنیا کے سب سے اچھے بابا ہیں۔ اُن جیسا دوسرا کوئی نہیں۔

میں اپنے بابا کے زیادہ قریب اس لیے بھی تھی کہ پہلی اولاد ہونے کی وجہ سے میں بھی اُن کا پہلا پیار تھی۔ بچپن میں ہی اُن کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ گھر میں ماں تھی نہ بہن صرف چھ بھائی اور باپ۔ مردوں کا گھر اور اسی لیے چار بیٹیوں کا باپ ہونا اُن کے لیے باعثِ مسرت بات تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ نہ صرف ہمارے بابا تھے بلکہ بڑے بھائی بھی تھے دوست بھی تھے رہنما بھی تھے۔ چاروں بیٹیاں اُن کو بہت عزیز تھیں مگر سب کو یہ احساس تھا کہ میری طرفداری کچھ زیادہ کرتے ہیں۔ ہم چاروں ماں سے زیادہ بابا کے قریب تھیں۔ ماں کے حصے کا لاڈ بابا سے ملا۔ روایتی گھروں میں جو بات بیٹیاں باپ کی بجائے ماں سے کرتی ہیں وہ ہم اپنے بابا سے بلا جھجک ڈسکس کر لیتے۔ اُن کے ساتھ کسی بھی موضوع پر بات کرنے میں ہمیں کبھی کوئی پریشانی نہ ہوتی۔ بابا کھلے ذہن، کھلی سوچ، نرم اور فراخ دل، خوش طبیعت شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے کبھی ہمارے اوپر کہیں آنے جانے پر پابندی نہیں لگائی نہ ہی بلا وجہ ٹوکا۔ مگر ان سب کے باوجود ان کا رُعب ایسا تھا کہ ہم اُن کی نظر پہچانتے تھے۔ اُن کے کچھ کہے بنا بھی اُن کا دبدبہ گھر پر چھایا رہتا۔ پنجاب یونیورسٹی میں ملازم تھے۔ لگی بندھی تنخواہ میں گزر بسر ہوتی۔ رہائش کے لیے بڑا سرکاری مکان ملا ہوا تھا جس کی بڑے سلیقے سے ماں نے آرائش کی تھی اور ماں کی نگرانی میں ہی لان میں طرح طرح کے پھول کھلائے جاتے۔ ماں کی ضد پر شہر کے بہترین انگریزی میڈیم سکول میں ہم نے تعلیم حاصل کی۔ ہمارے منہ سے نکلی ہر بات بابا پوری کرتے۔ اس بات پر اکثر ماں بابا سے الجھ جاتی کہ تم لاڈ پیار میں انہیں بگاڑ رہے ہو۔ ماں کا خفا ہونا اور بابا کا دو بول پیار کے بول کر منا لینا ہم سب کو اچھا لگتا تھا۔ گھومنے پھرنے بھی لے جاتے، فلم بھی دکھاتے اور کبھی کبھی کھانا بھی باہر کھلاتے۔ کبھی مالی تنگی کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی کوئی کمی محسوس ہونے دی۔ مگر اس سب کے باوجود ہمیں احساس تھا کہ بابا اپنی محدود تنخواہ میں گھر گرہستی چلا رہے ہیں۔

بابا کی شخصیت کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ سب سے کھلے چہرے سے ملتے۔ اُن کے چہرے پر ہمیں فکر یا پریشانی کا رنگ کبھی نظر نہیں آیا۔ ہر مشکل وہ بڑے صبر سے مسکراتے ہوئے برداشت کر لیتے۔ اُن کا ماننا تھا کہ ہر مشکل کا حل موجود ہے۔ اکثر کہتے ”چنتا چتا سمان ہے۔“ فکر دیمک کی طرح انسان کو کھا جاتی ہے اس لیے فکر نہ کرو حوصلہ رکھو۔ حس مزاح اُن کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ بات سے بات نکال کر قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتے۔ باذوق شخص تھے۔ شاعری کا ذوق مجھے اُن سے ملا۔ شاعری کی کتابوں کے علاوہ اکاؤنٹس کی کتابوں کا مطالعہ کرنا اُنہیں پسند تھا۔ ماں کو ہر چیز اپنی جگہ پر چاہیے تھی۔ گھر کی صفائی، سلیقے سے کی سجاوٹ اور پھول پودوں کے رکھ رکھاؤ کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اُن کا یہ شوق اکثر ہمارے لیے جی کا وبال بن جاتا۔ گھر کے کاموں سے جب اُنہیں فرصت ملتی تو محلے کی عورتوں کے ساتھ بیٹھنے کی بجائے وہ ہندی ناول پڑھنا پسند کرتی۔ میں ساتویں یا آٹھویں جماعت میں تھی جب میں نے ماں کے پڑھے ہندی ناول پڑھنے شروع کر دیئے تھے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ نثر کا

شوق مجھے ماں سے ملا۔ شہر میں کہیں بھی جب کوئی اچھا ڈرامہ کھیلا جاتا یا پھر مشاعرہ منعقد کیا جاتا تو اُس وقت صرف میں ہی بابا کے ساتھ جاتی۔ ماں کو اور میری چھوٹی بہنوں کو ان میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

بابا جتنے خوش اخلاق تھے ماں اُتنی ہی کم گو۔ بابا کی کوشش ہوتی سب کو دعا سلام کرتا چلوں اور ماں کی کوشش ہوتی کہ بنا کسی کی طرف دیکھے کسی سے ملے خاموشی سے نکل جائے۔ فرصت کے وقت جب پریوار کے سب فرد ایک ساتھ بیٹھے خوش گپیوں میں مشغول ہوتے تو بھی ماں سب کے ساتھ بیٹھی سب کی سُنتی مگر بولتی کم۔ جب تک گھر کا کام ختم نہ ہو جاتا ماں کی آواز کھل کر نکلتی سب کی شامت آئی رہتی اور کام ختم ہوتے ہی ماں کا روپ بدل جاتا۔ ایسے شانت ہو جاتیں جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔

ہمارے گھر میں نہ تو اکیلے بیٹھنے کی کسی کو اجازت تھی اور نہ ہی کبھی کسی نے اکیلے کھانا کھایا۔ بابا کے دفتر سے لوٹنے سے پہلے ہم چاروں بہنیں گھر پر موجود ہوتیں کیونکہ انہیں اچھا لگتا تھا کہ وہ گھر لوٹیں تو سب گھر پر ملیں۔ پھر سب ایک ساتھ شام کی چائے پیتے۔ کھانا بھی سب مل کر ہی کھاتے۔ بے شک کوئی بیمار ہو یا ناراض ہو کھانے کے وقت وہ کھانے کی میز پر موجود ہوتا۔ بابا کہتے ''بیماری اور ناراضگی اپنی اپنی جگہ کھانا اپنی جگہ۔ جو پریوار مل کر کھانا کھاتے ہیں وہ ہی ایک ساتھ رہتے ہیں ورنہ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے کا کیا فائدہ؟''

بابا رشتوں کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ہر رشتے کا اُنہیں پاس تھا۔ جتنا پیار اپنے بابا اور بھائیوں سے کرتے اُتنی ہی عزت اور پیار میری نانی اور ماما سے کرتے۔ گرمیوں کی دو مہینے کی چھٹیوں میں ہم دادا کے پاس جاتے اور سردیوں کے دو مہینے وہ ہمارے ساتھ رہتے۔ بابا دادا کا اس طرح خیال رکھتے جیسے کسی بچے کا خیال رکھتے ہیں۔ ہم نے بابا کو کبھی دادا کے آگے زبان درازی کرتے یا بحث کرتے نہ دیکھا انہوں نے جو زبان سے نکال دیا بابا نے سرخم کر کے قبول کر لیا۔ یہ عادت صرف بابا کی نہیں تھی بلکہ بابا کے سبھی بھائیوں میں تھی۔ شاید یہ سعادت مندی ہمیں وراثت میں ملی۔ سُنا ہے کہ دادا نے دادی کے گزر جانے کے بعد کوئی نشہ نہیں چھوڑا۔ بھری جوانی میں وہ ساتھ چھوڑ گئیں۔ نہ جانے کیسے انہوں نے اکیلے ہی لڑکوں کو پال پوس کر بڑا کیا مگر دوسری شادی نہیں کی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ دادا کے علاوہ کوئی بھی مرد نہ تو سگریٹ نوشی کرتا تھا اور نہ ہی شراب کو کسی نے ہاتھ لگایا۔ جب دادا ہمارے یہاں آتے تو بابا اُن کے حقّے اور کڑوے پانی کا انتظام کر کے رکھتے۔ دادا رات کے وقت کب پینے کا کام کرتے ہمیں نہیں معلوم ہم نے تو انہیں صرف حقّہ گڑگڑاتے ہی دیکھا۔

میری عمر شاید بارہ سال کی تھی جب دادا جی اچانک چل بسے۔ اُن کے ایک سال بعد میرے تایا جی چالیس کی عمر میں ہی دل کا دورہ پڑنے سے دادا سے جا ملے۔ ایک سال میں گھر کے دو سربراہ کھو دیئے ہم نے۔ تایا جی کی چار بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ سب سے بڑی بیٹی کی منگنی ہو چکی تھی شادی کی تاریخ ابھی پکی کرنی تھی اور سب سے بڑا بیٹا کچھ عرصے سے ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا۔ بابا نے اس کی نوکری یونیورسٹی میں لگوا دی تھی اور اسی لیے ارون بھیا ہمارے ساتھ ہی رہنے لگے تھے۔ تایا جی کی بیٹیاں بے حد خوبصورت تھیں مگر پڑھائی لکھائی میں ہاتھ کمزور تھا۔ تایا جی کے جانے کے بعد زندگی کی راہ دشواریوں سے بھر گئی تھی۔ جب تائی جی بیاہ کر سسرال آئی تھیں اُس وقت ان کی عمر چودہ سال کی تھی اور سب سے چھوٹے چاچا کی عمر شاید تین یا چار سال کی رہی ہوگی۔ دیور کو بھابی نے ماں کی طرح پالا۔ انہوں نے بھی انہیں ماں کا درجہ ہی دیا۔ بڑے بھائی کے ساتھ دکان پر جاتے۔ تایا جی کے بعد دکان کا پورا کام انہوں نے سنبھال لیا تھا۔ چنڈی گڑھ سے ڈلہوزی کا سفر بس سے بارہ گھنٹے بعد طے ہوتا تھا۔ بابا کو اس دوران کئی بار وہاں جانا پڑا۔ کبھی ماں کو بتا کر اور کبھی ماں سے چوری انہیں پیسے بھیجتے رہے۔ کچھ حد تک اب دو گھروں کی پرورش کا بوجھ بابا پر آن پڑا۔ بابا نے جب بھیا کو اپنی تنخواہ میں سے گھر پیسے بھیجنے کو کہا تو اُس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ ماں کا لاڈلا اور بابا کا سب سے عزیز بھتیجا تھا۔ لاکھ سمجھانے کے باوجود سب کی بات ان سنی کر کے گھر چھوڑ دیا۔ چھوٹی جگہ سے بڑے شہر میں آتے ہی وہاں کی آب وہوا نے بہت جلد اثر کیا تھا۔ نئی نئی دوستیاں، نیا ماحول اور مکمل آزادی مل گئی۔ اوپر سے باپ کا خوف بھی نہیں رہا۔ گھر کا بڑا بیٹا تھا اُسے بیوہ ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کا سہارا بننا تھا مگر اس نے ذمہ داریوں سے منہ موڑ کر اپنی آزادی پر توجہ دینا زیادہ بہتر جانا۔

سب چاچا کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ سب اپنے اپنے گھروں میں خوش باش زندگی بسر کر رہے تھے۔ سب سے چھوٹے چاچا تھے جن کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ بابا نے خط لکھے سب کو فون کیا اور یہ طے پایا کہ سب مل کر بھای کی بڑی بیٹی کی شادی کا انتظام کریں گے۔ لڑکے والے دلی کے تھے لہٰذا دلی جا کر دیدی کی شادی دھوم دھام سے کی گئی۔ دس دن بعد تائی جی کی دوسری بیٹی کی شادی بڑی سادگی سے ڈلہوزی میں ہوئی۔ دیدی کی شادی میں آئے مہمانوں میں سے کسی کو وہ پسند آ گئی اور وہ رشتہ لے کر پہنچ گئے۔ گھر بار اچھا تھا لڑکا بھی دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک تھا۔ تائی جی نے اپنے حالات بتائے کہ وہ اتنی جلدی شادی نہیں کر پائیں گے تو لڑکے والوں نے سادگی سے شادی کرنے کی پیشکش رکھ دی۔ تائی جی نے آس پڑوس کے بزرگوں سے مشورہ کیا اور سادگی سے بیٹی کو بیاہ کر رخصت کر دیا۔ بعد میں خط لکھ کر سب رشتے داروں کو اس کی اطلاع دے دی۔ بیوہ ماں کے کندھے سے دو جوان بیٹیوں کا بھار اُتر گیا تھا۔ دو بیٹیاں اور ایک چھوٹا بیٹا اُن کے پاس تھے۔ زندگی کے کچھ سال انہوں نے بہت مشکل سے گزارے۔

تایا جی کی موت نے بابا کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ یہ ہی وجہ تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ ہم سب پڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔

''اگر کل کو مجھے کچھ ہو گیا تو تم سب کیا کرو گی؟ کس کا منہ دیکھو گی؟''

دیدی کی شادی پر سب بھائیوں نے مل کر اپنے اپنے حساب سے جو رقم دی تھی وہ کافی نہیں تھی۔ اُسے پورا کرنے کے لیے بابا کو کسی سے قرض لینا پڑا تھا۔ ہمیں تو تب پتا چلا جب سردیوں کی شام کمبل میں لپٹا ایک شخص تقاضے کے لیے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ بابا اُس سے بچتے پھرتے تھے۔ پہلی بار ہم نے بابا کو پریشان دیکھا تھا۔ انہوں نے اوور ٹائم کے ساتھ دفتر کے بعد بھی کہیں کام کرنا شروع کر دیا۔ صبح سویرے نکل جاتے اور رات دیر سے لوٹتے۔ دھیرے دھیرے سود سمیت قرض کی ادائیگی بھی ہو گئی۔

دیدی کی شادی کے دوران چھوٹی چاچی نے سب کے بیچ بیٹھ کر جب کہا کہ ''یہ تو بہت مشکل ہے۔ ہم ہر بار کہاں سے ایسے مدد کر سکیں گے یہاں تو سب کی چار چار بیٹیاں ہیں ہم تو صرف یہ ہی نپٹاتے رہیں گے۔'' اُس وقت ماں نے غصے میں کوئی تلخ جواب دینا چاہا تو بابا نے اشارے سے انہیں روک دیا اور جواب دیا:

''فکر نہ کرو اس کے بعد کوئی تم سے کسی کی شادی کے لیے مالی امداد نہیں مانگے گا اور

نہ ہی تم سے کوئی شگن میں بھی ایک روپے سے زیادہ قبول کرے گا۔ یہ وعدہ ہے میرا تم سب سے۔'' اس شادی کے بعد بھائیوں میں فاصلے بڑھ گئے تھے۔ اُس سال میں نے دسویں کا امتحان دیا تھا اور رزلٹ کے بعد مجھے کالج میں داخلہ لینا تھا۔ اُن دنوں لڑکیوں کا ملازمت کرنے کا چلن عام نہیں تھا مگر بابا چاہتے تھے کہ میں بی اے کے بجائے دو سال کا ٹیکنکل کورس کرلوں۔ سُن کر پہلے تو مجھے بڑا دھکا لگا سکول کے دوستوں کے ساتھ کالج جانے کے کئی خواب سجا رکھے تھے وہ سب چکنا چور ہوتے دکھائی دیے۔ بابا نے کہا تھا:

''سوچ کر فیصلہ کرلو۔ ہوگا وہی جو تم چاہو گی۔''

اُس رات میں بہت روئی تھی۔ دیر تک سو نہیں سکی کیونکہ میں جانتی تھی کہ میں بابا کی مرضی کے خلاف نہیں جا سکوں گی وجہ ان کا خوف نہیں بلکہ اُن کی محبت تھی۔ اُن کی زبان سے نکلی بات میرے لیے رب کے فرمان کے برابر ہوتی ہے۔ میں اُن پر بوجھ نہیں بلکہ ان کا دایاں بازو بنانا چاہتی تھی۔ صبح میرا چہرہ دیکھ کر انہیں میرے فیصلے کا علم ہوگیا تھا۔ میرے دل کی ہر بات وہ میرے چہرے سے پڑھ لیتے تھے۔ میرا یہ فیصلہ کتنا صحیح تھا اس کا اندازہ مجھے آنے والے سالوں میں ہوا۔ دو سال کے سیکریٹریل پریکٹس کے کورس کے ساتھ ساتھ میں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کی پڑھائی جاری رکھی۔ کورس ختم ہوتے ہی دو مہینے بعد پنجاب کے نیم سرکاری ادارے میں ملازمت مل گئی۔ کچھ قریبی رشتے داروں کو میری نوکری پر اعتراض تھا مگر بابا نے کسی کی پرواہ نہیں کی۔ بیٹیوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کا اُن کا خواب پورا ہو رہا تھا۔ بابا نے ہمیں چار دیواری میں قید ہونے کے بجائے مکمل آزادی دی۔ ہمیں پنکھ دیے پرواز دی اور کھلا آسمان دیا۔ ہم چاروں بہنوں میں اتحاد بڑا زبردست تھا۔ ایک ساتھ فلم دیکھنے جاتیں، گھومنے پھرنے، شاپنگ کرنے، گھر کے کام اور رات کو پڑھائی بھی ساتھ بیٹھ کر ہوتی۔

نوکری کے ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ بی اے کے بعد جب ایم اے کرنے کا فیصلہ کیا تو گھر میں میری شادی کا باب کھل گیا۔ بابا نے سب سے پہلے مجھے بلا کر پوچھا ''اگر تمہاری نظر میں کوئی لڑکا ہو یا تمہیں کوئی پسند ہو تو بتا دو۔'' میں نے ہنس کر کہا ''ہوتا تو آپ کو ضرور معلوم ہوتا۔ آپ جانتے ہیں میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' ''کیوں؟ تم نہیں چاہتی میں اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہو سکوں۔'' ''میں بوجھ ہوں آپ پر؟'' ''تم بوجھ کیسے ہو سکتی ہو؟ تم تو میری آنکھ کا تارہ ہو۔'' ''میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتی بابا۔'' میں نے اُن کے کاندھے پر سر رکھ کر کہا ''جانا تو پڑے گا۔ میں تمہیں اپنے گھر میں ہنستا کھیلتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے بچوں کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہوں۔''

اس کے آگے کہنے کو میرے پاس کچھ رہ نہیں گیا تھا۔ میں خاموش ہوگئی۔ پھر رشتہ ڈھونڈنے کا سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ وقت کے ساتھ تکلیف اور مایوسی میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہر چھٹی والے دن یا تو بابا صبح نکل جاتے یا کوئی نہ کوئی گھر آ جاتا۔ نمائش کا دور بڑا تکلیف دہ تھا۔ کبھی کسی کو میں پسند نہ آتی کبھی کوئی مجھے پسند نہ آتا۔ بابا ایڑیاں رگڑتے نہیں تھکے تھے مگر میں اپنی نمائش سے تھک چکی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی شاید اسی لیے میرے دل نے کبھی کسی رشتے کے لیے حامی نہیں بھری۔ آپ اسے میرے کمزوری یا خامی کہیے کہ میں کوئی بھی کام زبردستی نہیں کر سکتی وہ کام بے شک میرے لیے کتنے ہی فائدہ کا ہو وہ ہرگز نہیں کروں گی جس کے لیے میرا دل آمادہ نہ ہو۔ آئے دن کی نمائش نے تلخی میرے اندر بھر دی تھی۔ آنے والا شکل وصورت کے علاوہ کیا دیکھ سکتا ہے؟ ویسے بھی نہ میں خوبصورت تھی نہ رنگ گورا نہ ڈبلی پتلی۔ عام سی شکل، گندمی رنگ اور بھرا جسم، سیرت پرکس کی نظر جاتی۔

وہ بڑا مشکل دور تھا ہم سب کے لیے۔ گھر کا ماحول افسردہ ہونے لگا۔ بابا فکرمند رہنے لگے اور ماں کی زبان اور کڑوی ہوگئی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا باقی تینوں کی عمر بھی بڑھ رہی تھی۔ ماں جس سے ملتی رشتے کی بات کرتی کسی کے گھر سے شادی کا کارڈ آتا تو ہمارے گھر کی فضا سوگوار ہو جاتی۔ بابا اکیلے ہی شادی میں شرکت کرتے ماں نے ساتھ جانا چھوڑ دیا تھا۔ لوگوں سے ملنا اُسے ویسے بھی زیادہ پسند نہیں تھا۔ اب تو وہ اور بھی کترانے لگی تھیں۔ میری وجہ سے گھر میں جو پریشانی تھی بابا کی مایوسی میرے دل و دماغ پر حاوی رہنے لگی۔ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اندر ہی اندر گھٹنے لگی۔ اس گھٹن سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگی۔ پھر اک روز میں نے خود سے اپنی تکلیف بانٹنے کا ارادہ کیا اور قلم پکڑ کر اپنے جذبات کاغذ پر اتار دیے۔ اُس روز میں نے خود کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کیا اور یہاں سے مجھے نیا راستہ مل گیا۔ قلم کا سہارا میں نے خود کی تکلیف دور کرنے کے لیے لیا تھا مگر دھیرے دھیرے کب میں خود کے حصار سے نکل کر دنیا کے حصار میں پہنچ گئی مجھے پتا نہیں چلا۔ پہلی کہانی ''تلخیاں'' لکھی جو ہند سماچار میں چھپی۔ نوکری، پڑھائی اور لکھنے میں خود کو مصروف کرلیا۔ ایک روز کڑا من کر کے میں نے بابا کو کہہ دیا:

''بابا آپ یہ سلسلہ یہیں روک دیں۔ میں اب کسی کے سامنے نمائش بن کر نہیں جاؤں گی۔ بہت ہوگیا بس اب اور نہیں۔ جو میری قسمت میں ہوگا وہ میرے پاس خود چل کر آئے گا اور اگر نہ ہوا تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے دے نہیں سکتی۔ اب آپ میری فکر چھوڑ دیں۔''

''تمہارے لیے کہنا آسان ہوگا میرے لیے کرنا آسان نہیں۔ تم جانتی ہو لوگ کیا کہتے ہیں؟'' ''مجھے پرواہ نہیں۔''

''مگر مجھے ہے۔ مجھے ابھی باقی بچیوں کی شادی بھی کرنی ہے۔ کب تک لوگوں کی باتیں سنتا رہوں؟ لوگ کہتے ہیں میں تمہاری کمائی کھاتا ہوں اس لیے تمہاری شادی نہیں کرنا چاہتا۔'' بات کہتے بابا کا گلا بھر آیا تھا اور اُن کی بات میرے سینے میں تیر کی طرح لگی تھی۔ دنیا اتنی بے حس کیسے ہو سکتی ہے؟

''دنیا دو دھاری تلوار ہے۔ لوگوں کا کام ہے کہنا کہنے دو۔ آپ کہتے ہو نا خود کو ٹھیک رکھو اور کسی کو کچھ کہنے کا موقع نہ دو؟ نہ آپ غلط ہیں نہ ہم ہمارے حالات ایسے ہیں وقت ایسا ہے۔'' ''ہم جس سماج میں رہتے ہیں اُن کو دیکھنا پڑتا ہے۔'' ''ہم سب جانتے ہیں آپ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہمیں آپ سے کوئی شکایت نہیں۔'' ''معلوم نہیں میرے نصیب میں یہ خوشی دیکھنی لکھی بھی ہے یا نہیں۔'' ''آپ تو کبھی مایوسی کی باتیں نہیں کرتے تھے اب کیا ہوا؟'' ''میں ہار گیا۔'' ''آپ ہار نہیں سکتے بابا۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ میری مانیں اور ریتو کے لیے رشتہ دیکھنا شروع کریں۔'' ''تمہاری ماں اس بات کے لیے راضی نہیں۔ وہ نہیں چاہتی کہ بڑی کو چھوڑ کر چھوٹی کی شادی پہلے ہو۔''

''اب یہ سب سوچنے کا وقت نہیں۔ سب پڑھ کر اپنے پیروں پر کھڑی ہیں۔ آپ کو جس کے لیے بھی رشتہ ملتا ہے اس کی شادی کر دیں۔ ہماری طرف سے آپ کو پوری آزادی ہے۔ ایک کے پیچھے آپ سب کا نقصان نہیں کر سکتے۔''

اُس دن کے بعد میں نے خود شادی کا باب ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ وہ دور میری زندگی کا سب سے بڑا تناؤ اور درد بھرا دور تھا۔ جو بھی ملتا سب سے پہلے شادی کا پوچھتا۔ سب کے سوالوں کے جواب دیتی تھک گئی تھی۔ اُن کی نظروں میں بے چارگی مجھے زہر لگتی۔ اوپر والے نے کسی کی زندگی کا خانہ مکمل نہیں رکھا سب کی زندگی میں کچھ خانے خالی ہوتے ہیں میری زندگی میں اگر یہ خانہ خالی ہے تو کیا؟ وہ جانتا ہے کس کے لیے کیا بہتر ہے۔ مجھے اپنے

فیصلے پر افسوس تھا اور نہ پچھتاوا۔ بابا ریٹائر ہو گئے اور ہم سرکاری مکان چھوڑ کر کرایہ کے مکان میں آ گئے تھے۔ ساری عمر بابا اپنا مکان بنانے کی مخالفت کرتے رہے کہتے تھے:۔

''بیٹیوں کی شادی ہو جائے گی تو ہم بوڑھا بوڑھی کہیں بھی کرایہ کے مکان میں رہ لیں گے۔ میں نہیں چاہتا جائیداد بنائی جائے اور دامادوں کے بیچ جھگڑے کا سبب بنے۔''

مگر اب کرائے کے مکان میں آ کر انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔ انہوں نے یونیورسٹی سوسائٹی کے بننے والے فلیٹ کے لیے درخواست کے ساتھ پیسے جمع کرا دیئے۔

ریتو کے لیے بھی رشتے کی تلاش شروع ہو گئی۔ ابھی ایک دو جگہ ہی بات چلی تھی کہ تیسری والی کے لیے گھر بیٹھے رشتہ آ گیا۔ سیما اُس وقت سکول میں پڑھاتی تھی۔ اس کے ساتھ کام کرنے والی ٹیچر اپنے دیور کا رشتہ لے کر آئی تھی۔ لڑکا پڑھا لکھا دیکھنے میں اچھا تھا اور پریوار بھی اچھا تھا۔ ماں اس کے لیے راضی نہیں تھی۔ وہ ایک کو چھوڑ کر دوسری کی نہیں کرنا چاہتی تھیں اور یہاں بات تیسری کی ہو رہی تھی۔ میں نے اور ریتو نے ماں بابا دونوں کو زور ڈال کر راضی کر لیا۔ گھر کی پہلی شادی تھی لہٰذا بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ ماں بابا کے چہرے کی رونق لوٹ آئی تھی۔ گھر میں نئی تازگی اور بہار چھا گئی۔ افسردگی کا ماحول دھواں بن کے اُڑ گیا۔ خوشیاں پھر سے لوٹ آئی تھیں۔ سال بعد ہی اس طرح سب سے چھوٹی جیوتی کے لیے بھی رشتہ آ گیا تو اُسے بھی دھوم دھام سے خوشی خوشی رخصت کر دیا۔ خوش قسمتی سے دونوں گھرانے بہت اچھے تھے۔ لڑکے بھی شریف ملنسار اور عزت کرنے والے۔ بہت جلد وہ سب کے ساتھ گھل مل گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بابا کی مصروفیت اور بڑھ گئی تھی۔ نوکری کے دوران ہی انہوں نے انکم ٹیکس اور سیلری ریڈی ایکسز تیار کرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ پنجاب کے سبھی سرکاری اداروں میں یہ استعمال ہونے لگا۔ یہاں تک کہ کورٹ کیس کے دوران بھی اسے تصدیق شدہ دستاویز مانا جانے لگا۔ پیسے کے ساتھ اُنہیں اس کام میں عزت اور شہرت بھی بہت ملی۔ ریڈی ریکسز کا کام وہ اکیلے ہی کرتے۔ کبھی کبھی پروف پڑھنے کے لیے ہم میں سے کسی کو بھی پکڑ لیتے۔

ہم نے کبھی انہیں صبح دیر تک سوتے نہیں دیکھا۔ جب ہم سونے جاتے تو وہ میز کرسی پر بیٹھے اپنا کام کر رہے ہوتے اور جب ہم صبح اٹھتے تو بھی وہ ہمیں کام کرتے ملے۔ ہم اکثر ان سے سوال کرتے ''آپ سوتے کس وقت ہو؟ نیند کیسے پوری ہوتی ہے آپ کی؟'' ہنس کر مخصوص جواب دیتے:

''نیند اور بھوک انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے جتنی چاہو بڑھا لو اور جتنی چاہو کم کر لو۔''

نہ وہ خود دیر تک سونا پسند کرتے تھے اور نہ ہی ہمیں سونے دیتے تھے۔ اگر اتوار کے دن ہم کہہ کر سوتے کہ ہمیں صبح جلدی مت اُٹھانا تو کچھ دیر تو وہ برداشت کرتے پھر بے چینی سے اندر باہر ٹہلنے لگتے اور بار بار کمرے میں آ کر کہتے:

''اٹھ جاؤ یار۔ بہت ہو گیا اور کتنا بور کرو گے۔'' گرمی کا موسم ہوتا تو اے سی پنکھا بند کر دیتے اور سردیاں ہوتیں تو رضائی کھینچ دیتے۔ مجبوراً اٹھنا پڑتا۔

ہم نے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ صبح بنا نہائے انہوں نے ناشتہ کیا ہو۔ سردی ہو یا گرمی، طبیعت ٹھیک ہو یا خراب نہانے میں ناغہ نہیں کیا۔ نہا کر دھوپ بتی کر کے ہی ناشتہ کرتے اور ہم لوگوں کو بھی کبھی بنا نہائے ناشتہ نہیں ملا۔

بابا کو کوئی بھی سواری چلانی نہیں آتی تھی۔ دراصل ہماری رہائش یونیورسٹی کیمپس میں ہی تھی اس لیے گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر پیدل ہی آتے جاتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جب کیمپس چھوٹ گیا تو انہیں آنے جانے میں دقت محسوس ہونے لگی۔ گھر پر ہم چاروں کے پاس سکوٹر اور گاڑی بھی تھی مگر وہ خود چلا نہیں پاتے تھے۔ انہوں نے سکوٹر اور گاڑی سیکھنے کا ارادہ کر لیا۔ ایک روز ریتو کا آٹو گیئر والا سکوٹر اٹھایا اور کہہ کر چلے گئے کہ ابھی چکر لگا کر آتا ہوں۔ دو گھنٹے گزر گئے اُن کا کوئی اتا پتا نہیں۔ ان دنوں موبائل تو ہوتے نہیں تھے لہٰذا گھر پر بیٹھ کر انتظار کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ تھا۔ بے چینی سے اندر باہر ٹہلنے لگے۔ دو گھنٹے بعد دیکھا جناب مسکراتے ہوئے سکوٹر چلاتے آ رہے ہیں۔ ہم سب گیٹ پر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی سکوٹر روکا اور خوشی سے بتانے لگے ''کیمپس کا چکر لگا کر آیا ہوں۔ کوئی دقت نہیں ہوئی۔'' اتنا کہتے سکوٹر اندر پارک کرنے کے لیے بڑھایا کہ ڈھلان کی وجہ سے توازن بگڑ گیا اور سکوٹر ایک طرف اور خود دوسری طرف جا گرے۔ شکر ہے کہ بچاؤ ہو گیا کوئی ہڈی پسلی نہیں ٹوٹی صرف معمولی کھروچ آئیں۔ اُس دن کے بعد سکوٹر چلانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اسی طرح گاڑی چلانے کا شوق چڑھا۔ دفتر کے ڈرائیور سے گاڑی سیکھنی شروع کر دی۔ دراصل ہر کام کے لیے ہمیں کہنا اُنہیں پسند نہیں تھا وہ چاہتے تھے کہ خود گاڑی چلانا سیکھ لیں تو کئی کام آسان ہو جائیں گے۔

اتوار کو ڈرائیور نے آنا نہیں تھا۔ مجھے کہنے لگے چل گاڑی کی پریکٹس کر لیتے ہیں۔ ہم دونوں گاڑی لے کر نکل گئے۔ تھوڑی دیر گاڑی گراؤنڈ میں چلائی پھر سڑک پر آ گئے۔ اس بار تو پہلے سے بھی زیادہ بُرا ہوا۔ موڑ کاٹتے وقت سٹیرنگ سنبھالتے سنبھالتے سامنے سے آتی گاڑی کے پیچھے دروازے سے ٹکراتی ہوئی گاڑ بیٹری پر چڑھا دی۔ چھٹی کی وجہ سے سڑک ویران تھی۔ کوئی جان کا نقصان نہیں ہوا کسی کو چوٹ نہیں آئی مگر دوسرے بندے کی نئی گاڑی بری طرح خراب ہوئی تھی۔ اُس کا غصہ ہونا تو لازمی تھا مگر جب ہم نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور کہا کہ ہم ہرجانہ بھرنے کو تیار ہیں تو وہ نرم پڑ گیا۔ بابا کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے اُس نے پولیس کو بھی نہیں بلایا۔ باتوں کے دوران جب یہ سامنے آیا کہ اُس کی بیٹی جیوتی کی سٹوڈنٹ ہے تو وہ اور نرم پڑ گیا۔ اُس نے بڑی عزت سے کہا ''آپ فکر نہ کریں میں انشورنس کلیم کر لوں گا آپ سے صرف گزارش کر سکتا ہوں آپ آئندہ پلیز سڑک پر گاڑی لے کر نہ آئیے۔'' جان بچی سو لاکھوں پائے۔ اُس دن کے بعد بابا نے توبہ کر لی۔

جب سیما کے یہاں بیٹا پیدا ہوا تو گھر میں نئی خوشیوں کے ساتھ بہار آ گئی۔ سیما کے ساس سسر بزرگ تھے بچہ سنبھالنا اُن کے بس میں نہیں تھا لہٰذا دونوں میاں بیوی صبح کام پر جانے سے پہلے روہن کو نانا نانی کے پاس چھوڑ کر جاتے۔ جولاڈ ماں نے ہمارے ساتھ نہیں کیے تھے وہ سب روہن کے حصے میں آئے۔

اُدھر سوسائٹی کے فلیٹس کے تعمیری کام زوروں پر تھے۔ ایک ہفتہ بھی نہ گزرتا کہ بابا فرمائش ڈال دیتے کہ چلو چل کر دیکھ آتے ہیں کام کہاں تک پہنچا۔ آئے دن آدھے ادھورے ڈھانچے دیکھنا ہمیں پسند نہیں تھا مگر اُن کا جوش اُن کی خوشی دیکھ کر منع کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ روہن ابھی دو سال کا ہوا تھا کہ جیوتی کے یہاں بیٹی نے جنم لیا۔ سریو کی آمد کی خوشی بھی گھر میں اُسی طرح منائی گئی جس طرح روہن کی منائی تھی۔ سریو سے ہفتے میں ایک ہی دن ملاقات ہوتی۔ اُسے گود میں اُٹھا کر لاڈ کرتے، تو تلی زبان میں باتیں کرتے، اُس کے ساتھ کھیلتے اور جب جیوتی جانے لگتی تو ایک ہی بات کہتے ''ابھی میرا دل نہیں بھرا اور تم اسے لے کر جا رہی ہو۔'' وہ بھی ہنس کر کہتی میرا دل بھی ابھی نہیں بھرا مگر ''میں جا رہی ہوں نہ۔ اگلی بار صحیح''

بچوں کے جاتے ہی گھر خالی لگنے لگتا۔ ہم چاروں رہ جاتے۔ اکثر شام کے وقت ہم

چاروں کسی نہ کسی کام کے لیے گاڑی میں نکل جاتے اور اس طرح شام ایک ساتھ اچھی گزر جاتی۔ مہینے میں کم سے کم ایک بار تو دونوں پریواروں کو بابا گھر پر کھانے کے لیے مدعو کر لیتے۔ کبھی کبھی سب کے ساتھ پہاڑوں پر پکنک پر جانے کا پروگرام بن جاتا۔ زندگی بڑی ہنسی خوشی گزر رہی تھی۔ روہن اور سریو ہاتھوں ہاتھ پلنے لگے۔ چار ماہ کے دو بچے ہوں تو لاڈ کی کیا کمی ہو سکتی ہے۔ میری پی ایچ ڈی کا کام مکمل ہو گیا تھا۔ بابا نے خود میرے ساتھ جا کر تھیسز (Thesis) جمع کروایا۔ شام کو جب بابا گھر لوٹے تو خوشی سے چہرا دمک رہا تھا۔ آتے ہی ماں کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ پکڑایا اور بولے:

''منہ میٹھا کرو۔ آج تمہاری بیٹی نے اپنا تھیسز جمع کروایا ہے۔'' ہندسما چار کے علاوہ اب مختلف رسالوں میں کہانیاں چھپنے لگی تھیں۔ ادبی سفر کے آغاز کا دور تھا۔ بکھری زندگی سمٹ گئی تھی۔ ہر چیز خوبصورت تھی، پرسکون، مسرتوں بھرے دن گزرنے لگے۔ مایوسی کے بادل چھٹ گئے تھے۔ بابا کی بس اب ایک ہی خواہش تھی کہ وہ جلد سے جلد بیٹیوں کو اُن کے گھر کی چھت دے سکیں۔ اٹھارہ دسمبر کی صبح نے اُن کا ہر خواب توڑ دیا۔ سڑک حادثے میں وہ بُری طرح زخمی ہو گئے۔ ہسپتال لے جایا گیا۔ داہنی ٹانگ کاٹنے کی نوبت آ گئی۔ خبر ملتے ہی ہم سب اُن کے پاس پہنچ گئے تھے۔ زخمی حالت میں بھی انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ درد سے کراہتے ہوئے بھی اُنہیں سب کی فکر تھی۔ بار بار ایک ایک کے بارے پوچھتے رہے۔ سب باہر کوریڈور میں تھے۔ ایکسرے، ٹیسٹ وغیرہ کے دوران میں اُن کے ساتھ رہی۔ ایک پل کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑا۔ وہ مجھے حوصلہ دے رہے تھے ''گھبراؤ مت سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم ڈاکٹروں کو کہو جلدی آپریشن کر دیں۔'' انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ ٹانگ کاٹنی پڑے گی۔ اپاہج ہو کر بابا پر کیا گزرے گی یہ سوچ کر میں کانپ اٹھی۔

بارہ گھنٹے کی تکلیف سہنے اور بھاگ دوڑ کے بعد انہیں آپریشن کے لیے لے جایا گیا۔ ہم سب باہر بیٹھے دعائیں کرنے لگے۔ پندرہ منٹ بعد ہی ڈاکٹر نے باہر آ کر کہہ دیا:

''آپریشن ابھی ممکن نہیں۔ انہیں دل کا دورہ پڑا ہے۔ پہلے ہمیں وہ دیکھنا ہوگا۔''

وارڈ میں شفٹ کر کے Ventilator پر رکھ دیا۔ اُس وقت بھی وہ ہوش و حواس میں تھے۔ بات کرنا ممکن نہیں تھا لہٰذا وقفے وقفے پر آنکھیں کھول کر دیکھتے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں کئی سوال مچل رہے تھے اور چیخ چیخ کر پوچھ رہے تھے کہ میں کب اس حالت سے باہر نکلوں گا۔ نہ جانے اُس وقت اُن کے ذہن میں کیسے خیالات گھوم رہے ہوں گے۔ وہ دن ہماری زندگی میں خوفناک خواب کی طرح تھے۔ دھیرے دھیرے اُن کے دوسرے اعضا نے کام کرنا بند کر دیا۔ پھر نہ انہوں نے آنکھیں کھولیں نہ ہی بات کی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ حالت نازک ہے کیونکہ ملٹی پل آرگن فیلیئر ہو گیا ہے۔ ہمارا دل حقیقت قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ روشنی کی کرن اب بھی باقی تھی۔ اُمید کا دامن چھٹا نہیں تھا۔

۲۰۔ دسمبر کی شام سب ہسپتال میں ہی موجود تھے۔ ایک سے زیادہ افراد اُن کے پاس نہیں بیٹھ سکتا تھے۔ سب باری باری اُن کے پاس جا رہے تھے۔ پانچ بجے کے قریب میں اُن کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بیٹھی تھی ساتھ میں مہامرتیونجے منتر کا جاپ بھی کر رہی تھی۔ اُن کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ پُرسکون۔ اچانک ان کے دائیں ہاتھ سے کرنٹ کی لہر میرے بازو سے ہوتی ہوئی میرے جسم سے نکل گئی۔ میں تذبذب کی کیفیت میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ سب کیا تھا کہ اُس لمحہ ڈاکٹر اور نرسوں کی ٹیم نے مجھے جلدی سے پیچھے ہٹا کر انہیں گھیر لیا۔ ایک نرس انجکشن تیار کر رہی تھی اور ڈاکٹر زور زور سے اُن کے سینے کو دبا رہا تھا۔ انجکشن لگنے سے پہلے ہی وہ زندگی کی بازی ہار گئے تھے۔ میں بُت بنی وہاں کھڑی یہ منظر دیکھتی رہی۔ نہ روئی نہ چلّائی۔ ڈاکٹروں نے Ventilator ہٹا دیا اور اُن کا چہرہ چادر سے ڈھانپ دیا۔ میں نے اُن کی روح کو جسم سے نکلتے دیکھا تو نہیں مگر محسوس ضرور کیا تھا۔ میں خاموشی سے انہیں وہیں چھوڑ کر باہر کوریڈور میں آ گئی۔ میرے سے پہلے میری شکستہ حالت نے سب کہہ دیا تھا۔ میں صرف اتنا ہی کہہ سکی:

''چلو گھر چلیں یہاں کا کام ختم ہو گیا۔''

اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ بابا کو اکیلے ہسپتال چھوڑ کر گھر آ گئے تھے۔ لگا ہی نہیں تھا کہ سٹریچر پر جسے ڈال رہے تھے وہ ہمارے بابا ہیں۔ وہ تو بے جان جسم تھا بابا تو ہم سے پہلے ہسپتال چھوڑ کر نکل گئے تھے۔ ہسپتال سے گھر تک کا راستہ میں نے بڑے حوصلے سے طے کیا۔ ایک لفظ میری زبان سے نہیں نکلا۔ ایک آنسو تک میری آنکھ سے نہیں ٹپکا مگر گھر میں گھستے ہی ضبط کے سارے بندھ ٹوٹ گئے۔ کتنی دیر دھاڑے مار مار کر روتی رہی مجھے نہیں معلوم۔ وہ رات ہزاروں سال جیسی لمبی رات تھی۔ لمحہ لمحہ صدیوں کے برابر گزرا۔ کون آیا کون گیا۔ کس نے کیا کہا کون کیا کر رہا ہے، ان سب سے لاتعلق مجھے کچھ احساس نہیں ہوا۔ صرف یہ محسوس ہوا کہ کڑی دھوپ میں کھلے آسمان کے نیچے ننگے سر کھڑی ہوں۔ اگلی صبح بابا کو رخصت کرنے سے پہلے مارچری سے گھر لایا گیا اور دوپہر تک انہیں سپردِ آتش کر کے اُن کے وجود کو بھی مٹا دیا گیا۔

بابا جاتے جاتے گھر کی رونق اور خوشیاں بھی ساتھ لے گئے۔ گھر ویران ہو گیا۔ وہ ایسا مرکز تھے جس کے ارد گرد گھر کی کائنات گھومتی تھی۔ ہر فرد اندر سے ٹوٹ گیا تھا مگر کوئی کسی کو اپنے زخم دکھاتا نہیں تھا۔ ماں ہمارے سامنے نہیں روتی تھیں اور ہم ماں کو اپنے آنسو نہیں دکھاتے تھے۔ بظاہر سب ہمت اور حوصلے سے کام لے رہے تھے مگر اندر سے سب ٹوٹ کر بکھر چکے تھے۔ وقت کا پہیہ کہاں رُکا ہے کسی کے لیے۔ زندگی کا نظام یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ اس خوفناک تنہائی اور اداسیوں کے حصار سے نکل کر آنے میں ہم تینوں کو کئی سال لگ گئے۔ دو سال بعد ہم اپنے اُس گھر میں آ گئے تھے جس گھر کی بابا کو شدید تمنا تھی۔ اُس دن اُن کی آتما کو یقیناً سکون ملا ہوگا جب اُن کی دی ہوئی چھت اُن کی بیٹیوں کے سر پر تھی۔ فلیٹ کی آخری پائی تک انہوں نے ادا کی تھی مگر اوپر والے کا حکم نہیں تھا کہ وہ اپنے گھر میں ایک دن بھی سانس لے سکیں۔ نہ جانے کون سے جنم کا قرض تھا جو وہ چُکا کر چلے گئے۔

آج پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو خود کو خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ عمر کے چالیس سال مجھے بابا کی شفقت اُن کا ساتھ نصیب ہوا۔ اُن کے زیرِ سایہ زندگی ہر ذمہ داری ہر فکر سے بے نیاز تھی۔ لڑکیوں کو کم ہی نصیب ہوتا ہے اتنے لمبے عرصے کا ساتھ ورنہ یہ ساتھ تو پرائے گھر جاتے ہی چھوٹ جاتا ہے۔

بابا بے شک اس دنیا میں نہیں رہے مگر سب میں کچھ نہ کچھ حصہ اُن کا زندہ ہے۔ وہ جا کر بھی سب میں زندہ ہیں۔ کہتے ہیں رشتے ایک جنم کے نہیں جنم جنم کے ہوتے ہیں۔ ہر رشتہ لین دین کا ہوتا ہے، حساب ابھی بھی باقی ہے۔ کہانی ختم نہیں ہو سکتی یہ جنم جنم تک جاری رہے گی۔

ہر اک بات کا میری خدا رہے گا گواہ
ہر اک جنم کی ہے یہ اک جنم کی بات نہیں

❑❑❑

ملکیت سنگھ مچھانہ

بٹھنڈہ، پنجاب

9646114221

ماہِ کامل

افسانہ

اِس میں اُس بے چاری کا تو کوئی قصور نہیں تھا سب رب کی مرضی تھی مگر پھر بھی کوئی اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کو تیار نہیں تھا۔اس نے پتا نہیں کس جنم میں بداعمالی کی تھی کہ جو اس جنم میں شامت اعمال بھگت رہی تھی!!

جو بھول کر بھی اسے ایک بار دیکھ لیتا، دوبارہ اس کی ہمت نہیں تھی ہوتی کہ اس کی جانب دیکھ لے۔اس کی خود کی بھی مجال نہیں تھی کہ کسی کو جی بھر کے دیکھ سکے۔دراصل اس کے چہرے پر پیدائشی ہی دو مسے تھے۔ایک دم تیکھے تیکھے کیل جیسے بالکل گینڈے کی طرح۔ان کی وجہ سے اس کی شکل شدید ہیبت ناک نظر آتی تھی لازم ہے کہ ایسی شکل دیکھ کر کچھ لوگ اسے طلعت منحوس بھی گردانتے ہوں۔

اُس وقت اس کی عمر بھی کیا تھی جہاں ہم پڑھتے تھے اس اسکول میں جب وہ آٹھویں جماعت میں داخل ہونے آئی تھی بہ مشکل پندرہ برس کی ہوگی۔وہ اس ڈال کی طرح تھی جس نے ابھی شاخ پر منہ نکال کر منظر دیکھا تھا۔اس گاؤں میں اس کی ننھیال تھی۔کہنے والے کہتے تھے کہ اس نے داخلہ یہاں اس لیے لیا تھا کہ اس کا خیال تھا کہ ہمارے اسکول میں درس و تدریس کا معیار بہت عمدہ اور بلند پایہ کا ہے لیکن ساتھ پڑھنے والے اکثر طلباء کا ماننا تھا کہ یہ سب تو اس کا بہانہ ہے اصل وجہ تو اس کی بدصورت شکل ٹھہری ہوگی جس کے سبب اسے اس کے ددھیال والے اسکول سے نکال دیا گیا ہوگا۔نام تو اس کا ہرپال کور تھا اور سب اسے 'لالی' کے نام سے جانتے تھے۔مگر لالی کا لال رنگ اس کے چہرے پر کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔لکھنے والے نے اس کے نصیب سیاہ جو لکھ دیے تھے سیاہی کی دوات ایک بار تو اس کی زندگی کے پورے کینوس پر بکھیر دی تھی بے چاری سارا دن منہ ڈھنک کر رکھتی جماعت میں ہر بینچ پر تین تین لڑکیاں بیٹھتی تھیں مگر لالی والے بینچ پر صرف دو بینچ کے ایک سرے پر لالی اور دوسری لڑکی بینچ کے عین دوسرے سرے پر کہ کہیں اس پر لالی کا سایہ ہی نہ پڑ جائے۔نگاہ حقارت اس پر اس قدر مہربان تھی کہ کئی بار تو اسے پانی کے ہتھ نلکے کو خود چلا کر پانی پینا پڑتا تھا۔خالی اوقات اور آدھی چھٹی کے وقت جہاں دوسرے بینچوں پر لڑکیوں کی دھما چوکڑی مچتی تھی لالی کے بینچ پر شہر خاموشاں جیسی خاموشی چھائی رہتی تھی !!

ابھی تو اچھا تھا کہ لڑکے اور لڑکیوں کے دو سیکشن ہونے کی وجہ سے وہ الگ الگ کمروں میں بیٹھتے تھے نہیں تو اس کو لڑکوں کی چشم سے بھی دو چار ہونا پڑتا۔کوئی بھی طالب علم نا اس کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھتا اور نا آنکھ بھر کر دیکھتا حتیٰ کہ فربہ جسم کا مالک بلونت سنگھ عرف بلّو بھی اس سے دامن بچاتا پھرتا کہ کہیں اس (لالی) کی نظر اس (بلّو) کے سانولے رنگ کو مزید سیاہ نہ کر دے۔اسکول کے طلباء اسے دیکھ کر اکثر اپنا راستہ بدل لیتے تھے اور کبھی کہیں لالی سے ان کی آنکھیں چار ہو جاتیں تو اکثر لالی انھیں اپنے بارے میں سرگوشیاں کرتے محسوس کرتی۔یہ منظر اس کے وجود پر بجلی بن کر گر جاتا۔کئی بار تو ان کی غیبت گوئی صاف طور پر لالی کے سماعت سے ٹکرا جاتی کہ 'یار! یہ چودھویں کا چاند کہاں سے ماتھے لگ گیا!!''

اس پر وہ بے یار و مددگار تڑپ کر رہ جاتی اور دل ہی دل میں اپنی قسمت کو کوستی رہتی! میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا جو تو نے مجھے اتنی بھدی صورت سے نوازا ہے۔اگر تیری یہی رضا تھی کہ میرے وجود کو داغدار کرنا تھا تو بدن کے کسی اور عضو پر کوئی داغ دھبا ڈال دیتا کم از کم جسے میں اپنے کپڑوں کے تلے تو چھپا لیتی اب یہ گینڈے کا چہرہ میں کہاں چھپاؤں؟؟؟ اور اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھر جاتا۔

وہ لامتناہی الم کی چکی میں پس رہی تھی!!

کیا واقعی اس پر غضب الٰہی نازل ہوا تھا جو وہ معاشرے میں نفرت و کراہت کا شکار ہو رہی تھی اور اپنی بدصورتی کے سبب اپنے کو کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں سمجھتی تھی۔ دیکھنے والے اس کے چہرے کو دیکھتے تھے اور اس کے جسم سے بے نیاز تھے۔ چہرہ دلی کیفیت کا آئینہ ضرور ہوتا ہے مگر سب کچھ نہیں ہوتا۔

ڈاکٹروں نے بھی ایک طرح سے اسے جواب دے دیا تھا یہ کہتے ہوئے کہ:

” ان مسوں کو نکالنے کے بعد ممکن ہے کہ تیری نظر کمزور ہو جائے یا کسی آنکھ کی نظر جا بھی سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تیرے چہرے پر ان کے نشانات باقی رہ جائیں اور تیری شکل پہلے سے بھی بھونڈی ہو جائے“۔

دو برس اس درماندہ نے اپنے دوپٹے کے ساتھ بڑے سخت کاٹے۔ چہرہ چھپانے کی تکلیف کوئی لالی سے پوچھے۔ ماضی میں کوئی پچاس برس پہلے علاج معالجہ بھی اتنا ترقی یافتہ نہیں تھا جتنا کہ آج ہے۔ سائنس کی ترقی نے نہ صرف سائنس کو بدلا ہے بلکہ زندگیوں کو بھی بدل دیا ہے۔

کہتے ہیں وقت بدلتے دیر نہیں لگتی

نہ جانے کب غم کے بادل چھٹ جائیں اور چہرے پر مسکراہٹ بکھر جائے

پریشانیوں کے بادل اگر مسلسل برس رہے ہوں تو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ سر پر خدا کی رحمت کی چھتری بھی ہے اندھیرا چاہے کتنا بھی گہرا ہو، روشنی کی ایک کرن اسے چیر کر ضرور نمودار ہو جاتی ہے ایک دن جب لڑکیوں کی جماعت سائنس لیب میں پریکٹیکل کر رہی تھی تو لالی کو دیکھ کر سائنس ماسٹر چمن لال کے من میں پتا نہیں کیا خیال ابھرا.. بغیر کچھ سوچے سمجھے انھوں نے لیب میں سے کسی کیمیائی مادے کی قلیل سی مقدار لے کر اسے لالی کے منہ پر اگے دونوں مسوں میں سے ایک پر لگا دیا !

اب پتا نہیں ماسٹر جی کے دل میں لالی کے لیے رحم تھا یا پھر ان سینگ جیسے مسوں سے انتہا درجے کی نفرت تیسرے دن تک وہ مسہ جس پر ماسٹر جی نے کیمیائی مادہ لگایا تھا قدرے سکڑ گیا اور لالی کو بھی کوئی تکلیف نہ ہوئی الٹے وہ کچھ راحت محسوس کر رہی تھی۔ اس کام سے حوصلہ مند ہو کر ماسٹر جی نے اسی کیمیائی مادے کی اتنی ہی مقدار فوراً دوسرے مسے پر بھی لگا دی اس کا انجام بھی پہلے جیسا ہی ہوا۔ تیسری بار پھر انھوں نے قدرے مقدار ان دونوں مسوں پر لگا دی بس جی !!! پھر کیا تھا؟؟؟

اگلے ایک ہفتے میں ماسٹر جی کا لگایا کیمیائی مادہ بلکہ یوں کہیے کہ لگائی ہوئی مرہم کسی جادو کی چھڑی کی طرح کام کر گئی جیسے جادوگر نے چھڑی گھمائی اور چھو کہا۔ بس ! لالی کے مسّے غائب مسوں کا استیصال لالی کا منہ بالکل صاف ایک دم لق و دق میدان جیسے کسی نے دودھ ملائی اور مکھن سے اسے دھو دیا ہو سمجھو تمام عمر کے لیے ہی اس لڑکی کا دکھ کاٹا گیا وہ شباب میں قدم رکھ رہی تھی اس کا وجود روز افزوں اضافہ کر رہا تھا اس لیے اس کے منہ پر نئے نویلے گوشت پوست نے قبضہ کر لیا اور ان مسوں کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہا۔

لالی کے ماں باپ جو اس کے مستقبل کو لے کر اس کے جنم ہی سے شدید تر رنج و غم میں مبتلا تھے۔ اس فوق الفطرت نظارے کو دیکھ کر اب پھولے نہیں سما رہے تھے۔ سائنس ماسٹر جی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ان کو الفاظ نہیں جڑ رہے تھے۔

دیکھا جائے تو ماسٹر صاحب کی اس دلیرانہ کارروائی کم لاپروائی سے اگر اس لڑکی کی حالت مزید بگڑ جاتی تو ان کا کسی بھی رخ بچاؤ ہونا ناممکن تھا مگر ہونہار ٹلتی نہیں ہو وے بسوئے بیس ہونی بلوان ہے اور ہو کر رہتی ہے۔ کس کو کیا عطا کرنا ہے عزت یا ذلت یہ دونوں ہی عطا کرنے والی ذات اس سوہنے ربّ کے ہاتھ میں ہے۔

وہ جسے ذلیل کرنا چاہے تو سارا زمانہ بھی مل کر اسے عزت عطا نہیں کر سکتا اور جسے وہ عزت سے نوازنا چاہے اسے کل کائنات مل کر بھی ذلیل و رسوا نہیں کر سکتی جس لڑکی کے مسوں کو ڈاکٹروں نے نکالنے سے جواب دے دیا تھا اس کو ماسٹر جی کے دست شفا سے راحت مل گئی تھی اور مرض اشد سے سدا کے لیے نجات حاصل ہو گئی تھی۔

چہرے کا جاہ و جلال جو اب تک ان مسوں نے دبا رکھا تھا اب نکھر کر سامنے آنے لگا۔ چہرے پر اتنی خیرہ کن چمک اٹھ کھڑی ہوئی تھی کہ جیسے سورج ابھی ابھی کسی پہاڑی کی اوٹ سے نکلا ہو۔ اس کا شمشیر بُرّاں ناک دیکھنے والے پر تلوار برساتا تھا۔ گول گول موٹی موٹی آنکھیں ہونٹ سرخی سے لبریز ہو کر گلاب کی پنکھڑیاں بن بیٹھے تھے۔ چہرے پر پھیلی سیاہی و تاریکی کی سلطنت کو اب جوانی کے سورج نے سمیٹ دیا تھا۔

بارہویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے وہ لڑکی مکمل طور سے ’حور پری‘ بن چکی تھی سچ مچ کی لالی جو طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت افق پر نمودار ہوتی ہے آسمانی سرخی موج شفق جس آئینہ کے سامنے جانے سے وہ گھبراتی تھی جس سے آنکھ ملانے سے وہ ڈرتی تھی اب وہی آئینہ اس کے آئینہ جمال کو جھیلنے کا متحمل نہیں تھا گویا اس (آئینہ) میں کہیں شگاف ہی نہ پڑ جائے۔

اس کی ہم جماعت طالبات جو پہلے بات بے بات اس سے فاصلہ رکھتی تھیں اب ہر بات پر اس شاہ خوباں سے ہم آہنگ ہونے کی ہر ممکن ترکیب لڑاتیں اور اس کی دوستی پانے کو موج بے تاب کی مانند اس کی جانب لپکتیں جو پہلے اس کے سائے سے بھی ڈرتی تھیں اب ایک دوسری سے بڑھ کر اس کے پہلو نشین ہونے کی ضد کرتیں اور اسے بار بار اپنے ساتھ اپنے بینچ پر بیٹھنے کو مدعو کرتیں۔

لڑکوں کی نگاہ کتابوں پر کم اور اس مرکوز خاطر پر زیادہ مرکوز رہتی انیس برس کی اس ماہ رُخ لڑکی نے ایک بار تو سب کی نبضیں بند کر دی تھیں اور اور یہ سب کسی قدرت کا نہیں بلکہ سائنس ماسٹر جی کے ہاتھ کا کمال تھا یا پھر اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سائنس ماسٹر جی کی بے اعتنائی و بے ساختگی کا نتیجہ تھا ہمارا اسکول لالی کے ننھیالی گھر سے تقریباً ایک کلو میٹر کے فاصلے پر واقع تھا گاؤں کے عین دوسری طرف۔ اس کو پورے گاؤں کے وسط سے گزرنا پڑتا تھا۔ اب گاؤں کے شوخ مزاج لڑکے اس کا دیدار کرنے کے واسطے اس کی راہ میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس لیے وہ اپنے سائیکل کی چین اتار کر یا کبھی ٹائر کی ہوا نکال کر رکنے کا بہانہ بنا لیتے تھے۔ آنے بہانے سے اس بدر کامل سے ہم کلام ہونے کے خواہش گر رہتے۔ لالی اب دھیرے دھیرے ان کی شوخیوں کو سمجھنے لگی تھی۔

ایک حسن آدمی، ہزار حسن کپڑا لاکھ حسن زیور، کروڑ حسن نخرا بس ! شب و روز ہٹی بھٹی سب جگہ لالی ہی کے حسن اور ناز نخرے کے چرچے چلتے تھے بارہویں پاس کرنے کے بعد جب لالی نے کالج میں قدم رکھا وہاں بھی اس کے خد و خال کی دھوم مچ گئی۔ اس کا گدرایا ہوا جسم اور انتہائی خوبصورت سراپا کسی کے بھی ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔ وہ اپنے پر شباب جسم اور آتش فشاں حسن کو چھپانے میں ناکام سی رہتی بس ! جدھر سے بھی گزرتی تھی ایک ہنگامہ سا برپا ہو جاتا۔ اس لیے ہر لڑکا اس کا دیوانہ تھا۔ لڑکیاں اس کو

دیکھ کر رشک کرتی تھیں۔

اس رشکِ مہر و قمر کے حسن کا جادو دیگر لڑکوں کی مانند اب آبنوس کے کندے بلّو کے بھی سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔ بلو نے بارہویں جماعت بڑی مشکل ہی سے پاس کی تھی مگر پہلوانی کے زور پر سپورٹس کوٹے میں اسے اس کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ لالی کیوں کہ اس کے اسکول ہی سے اس کالج میں آئی تھی اس لیے وہ لالی پر اپنا حق کچھ زیادہ ہی جتاتا تھا۔ لالی نے جب بلّو کو گھاس نہ ڈالی تو وہ اسے روز تنگ کرنے لگا۔ جہاں اس کا داؤ لگتا وہیں اس پر ناشائستہ کلمات کی بوچھار کر دیتا جس سے لالی کے دل میں پھانس چُبھ جاتی۔ اب پھر لالی کی زندگی اجیرن بن گئی تھی مسرت بخش اور پر شباب حسن اب رفتہ رفتہ اس کے لیے عذاب جاں بنتا جا رہا تھا وہ اس نئے ماحول سے حد درجہ دکھی تھی اور دنیا کی نظروں سے بچنے کے لیے اپنا منہ پھر سے ڈھنک کر چلنے کی کوشش کرتی۔ وہ اضطرابی کیفیت میں بڑبڑاتی 'لگتا ہے رب نے میرے ساتھ شدید بیر کمایا ہے خدا واسطے کا بیر جہاں پہلے بدصورتی کی سیاہی کا کل ٹھیکرا میرے اکیلی کے سر پھوڑا تھا ... اب حسن و جمال کا تمام پیالہ بھی میرے اکیلی کے سر ہی انڈیل دیا ہے زندگی کا ابتدائی تاریکی مرحلہ تو میں نے جیسے تیسے پار کر لیا تھا مگر عالم شباب میں اس پری پیکر کو سنبھال کر چلنا میرے بس کی بات نہیں کاش! پھر سے میں پہلے جیسی ہو جاؤں' ماضی کے تمام دریچے خود بخود وا ہوتے چلے گئے اور پورا ماضی آئینہ بن کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اسے لگتا کہ اس کا وہی بدنما چہرہ، وہ سرگوشیاں کرتی ہوئی زبانیں اس کے لیے اب سے کہیں بہتر تھیں اب لالی کو رہ رہ کر سائنس ماسٹر جی پر غصہ آ رہا تھا جس نے گل بازی پلٹ دی تھی جی چاہ رہا تھا کہ اڑ کر ابھی ان کے پاس چلی جاؤں اور ان سے کہوں ماسٹر جی! مجھے نہیں بننا ہے چودھویں کا چاند ' بس ا مجھے تو میرا پہلے والا رنگ روپ ہی لوٹا دو میرا وہی چہرا ساس پر وہی دوسینگ دو پہرہ دار جو مجھے ہوس کی نگاہوں سے بچاتے تھے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ یہ میرا چاند سا مکھڑا کہیں میرا اتنا دوکھی نہ بن جائے کہ یہ ہوس کے شکاریوں کے ساتھ مل کر میری عصمت کو تار تار کر دے کالج سے باہر نکل کر سڑک پر چلتے ہوئے وہ ابھی دل میں یہ باتیں سوچ ہی رہی تھی کہ پتا نہیں بلّو کہاں سے آ ٹپکا۔ اس ناگہانی بلا کو دیکھ کر لالی کی سانسیں تیز ہو گئیں اور اس کا تخیل یک دم منتشر ہو گیا۔ بلّو نے لالی کا راستہ روکا اور اس سے کڑک کر پوچھا ''اچھا! تو پھر جناب نے کیا سوچا ہے میرے بارے میں؟؟؟'' اور یک بیک ہی جب اس نے لالی کی بانہہ پکڑنے کی کوشش کی تو لالی نے اپنی بانہہ کو پیچھے کھینچتے ہوئے پورے زور سے بلّو کے منہ پر تھوک دیا۔ لالی نے اب تک اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کی بہت کوشش کی تھی اور صبر و برداشت کے لبالب بھرے پیالے کو چھلکنے نہیں دیا تھا مگر آج بلّو کی اس مذموم حرکت پر صبر کا دامن اس کے ہاتھ سے جاتا رہا وہ غصے میں لرزنے لگی!!! اس پر بلّو نے قہر آلود آنکھوں سے اپنے کھیسے سے ایک شیشی نکالی اور اسے لالی کی آنکھوں کے سامنے ہوا میں اچھال دیا اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اور شیشی کو دوبارہ پکڑ پاتا، لالی نے جست لگا کر اس کو اچک لیا اور چشم زدن میں اپنے منہ پر انڈیل لیا۔

ایک دھنوئیں کا بادل سا اوپر کو اٹھ گیا!

ساتھ ہی لالی کا ایک زوردار قہقہہ بھی!!

مگر اس کا منہ دیکھ کر بلو کی چیخ اس کے گلے ہی میں اٹک گئی!!!

❑❑❑

غزل

چل رہی تھی جس پہ میں وہ راستہ انجان تھا
یوں تو اس پہ گامزن دنیا کا ہر انسان تھا

ہم سفر میرا وہ کتنا اجنبی سا ہو گیا
میری اپنی زندگی کا جو کبھی عنوان تھا

شخص وہ جو جا رہا تھا مجھ کو تنہا چھوڑ کر
عمر بھر میرے لیے وہ ایک سائبان تھا

بات جو کرتے تھے اکثر عرش پر پرواز کی
اوندھے منہ گرنے کا ان کے کس قدر امکان تھا

آس کی اہٹ سن کے دل کو یہ تسلی ہو گئی
آ گیا وہ زندگی کا جو میری ارمان تھا

ہم کو ان کے پاس آنا جس قدر دشوار تھا
ان کو انجم دور جانا کس قدر آسان تھا

ڈاکٹر قدسیہ انجم علیگ
۱۱/۰۷، پکا باغ، سہارنپور
9837378699

آسیہ خاتون

ایڈیٹر: ماہ نامہ نیا دور، لکھنؤ

9721856191

ایک کپ کافی

افسانچہ

ہمیشہ کی طرح اپنے خیالوں میں مست اور بے نیاز، نوشین جب لفٹ کے اندر داخل ہوئی تو کسی کی طرف دیکھے بغیر اس نے تیسری منزل کا بٹن دبانے کو کہا۔ لفٹ میں پہلے سے تین چار لوگ موجود تھے۔ اس نے اپنی جگہ بنائی اور موبائل کی اسکرین پر نظریں جمالیں۔ اسے اس بات کا بالکل احساس نہ ہوا کہ کوئی نظر اس کی طرف متوجہ ہے۔ اپنی منزل آتے ہی تیسری منزل پر اترتے ہوئے نوشین نے دیکھا کہ ایک شخص جسے دوسری منزل پر اترنا تھا، یہ کہتے ہوئے باہر نکلا کہ...'' مجھے دوسری منزل پر اترنا تھا... غور نہیں کیا اور منزل پیچھے چھوٹ گئی۔'' نوشین نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا...'' سیڑھیوں سے دوسری منزل پر چلے جائیے۔'' عارف آگے بڑھتے ہوئے رک گیا اور بولا:'' آپ اسی آفس میں ہیں؟'' نوشین نے جواب دیا: '' جی۔'' عارف کا اگلا سوال آیا:''کس عہدے پر ہیں؟'' جواب ملتے ہی عارف نے تھوڑا ہچکچاتے ہوئے پوچھا:''کیا آپ کا موبائل نمبر مل سکتا ہے؟'' نوشین، جو کسی بھی بات پر زیادہ (react) نہیں دیتی تھی، تھوڑی دیر رک کر اس نے اپنا موبائل نمبر دے دیا۔ عارف نے نوشین کا نمبر محفوظ کرتے ہی سلام عرض کیا اور کہا:'' آپ سے مل کر اچھا لگا۔'' نوشین نے اس پیغام کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اگلی صبح فون چیک کرتے ہوئے دیکھا کہ عارف کا 'گڈ مارننگ میسج' پڑا ہے۔ نوشین دکھنے میں خوبصورت اور پُرکشش تھی، اس کے لیے یہ روز کی بات تھی۔ کئی دنوں سے چل رہے عارف کے 'گڈ مارننگ' کا جواب اس نے ویری گڈ مارننگ سے دیا۔ عارف کے حوصلے بلند ہو گئے۔ اس نے فوراً ہی پیشکش کی:'' میں آپ کے ساتھ ایک کپ کافی پینا چاہتا ہوں۔'' نوشین بولی:'' میں کسی اجنبی کے ساتھ باہر نہیں جاتی۔'' عارف بولا:'' آپ کی مرضی کی جگہ اور وقت کے حساب سے میں سب رکھوں گا... پلیز منع مت کریں۔'' بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس نے کہا:'' اگلے ہفتے مجھے بیرونِ ملک جانا ہے... جانے سے پہلے میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اگلی صبح عارف کا میسج آیا:''کیا آپ آج ملیں گی؟'' اس پر نوشین نے ہامی بھر دی:'' جی''، اور پوچھا:''کس وقت اور کہاں؟'' عارف بولا:'' آپ کی سہولت کا پورا خیال رکھوں گا... آپ وقت اور جگہ خود طے کر کے بتا دیں... میں پہنچ جاؤں گا۔''

طے شدہ وقت اور جگہ پر پہنچ کر نوشین نے دیکھا کہ عارف پہلے سے ہی وہاں موجود تھا۔ وہ بول پڑی:'' آپ کو انتظار تو نہیں کرنا پڑا؟'' عارف بولا:'' میں تو آپ کا انتظار زندگی بھر کر سکتا ہوں...'' کہتے کہتے اس نے نوشین کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ نوشین کچھ بول پاتی کہ عارف نے اس کی انگلی میں انگوٹھی پہناتے ہوئے کہا:'' یہاں بہت بے سکونی ہے، میں نے ایک کمرہ بُک کر رکھا ہے، آپ چاہیں تو ہم وہاں آرام سے بیٹھ کر اپنے دل کی باتیں کر سکتے ہیں'' اور یہ کہتے کہتے اس نے اپنا سر نوشین کے کندھے پر رکھ کر تصویر کھینچنی چاہی۔ نوشین پڑھی لکھی اور کافی سمجھدار لڑکی تھی، اس نے فوراً بھانپ لیا کہ یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔ اس نے عارف کو ڈانٹتے ہوئے کہا:''تم نے مجھے کافی پینے کے لیے بلایا تھا یا یہ سب کرنے کے لیے؟'' وہ اٹھی اور تیز قدموں سے ریسٹورنٹ سے باہر نکل گئی۔ اپنی نادانی پر افسوس کرتے ہوئے اس نے خود سے کہا:'' نوشین تم یہ کیا کر رہی تھیں؟ کیا تمہیں آج کل کے ورچوئل کرائم کے بارے میں نہیں پتہ؟ آج کچھ غلط بھی ہو سکتا تھا... خیر جو ہوا، اب آئندہ خیال رکھنا ہوگا۔'' اگلی صبح جب وہ آفس پہنچی تو اس نے دیکھا کہ گیلری میں عارف اس کی ایک (colleague) سے موبائل نمبر مانگتے ہوئے اسے کافی کی پیشکش کر رہا تھا۔

❑❑❑

رئیس صدیقی

بنگلو نمبر ۲۔راحت کدہ، گرین ویلی انکلیو، ایئر پورٹ روڈ، بھوپال

9810141528

افسانچہ

سسکتا رشتہ

دھت.....دھت.....اَبے چُپ۔ یہ کتے بھی ہمیشہ بے وقت کا راگ الاپتے رہتے ہیں! کسی کی بہکی بہکی آواز سرد فضاؤں میں گونجی اور سامنے کی گلی کے کُتّے ایک سُر میں بھونک نے لگے۔ میں اپنے گھر کی دوسری منزل پر بنے اپنے کمرہ میں لیٹا محوِ مطالعہ تھا اور دیوار پر آویزاں گھڑی رات کے گیارہ بجا رہی تھی۔ کتّوں کی آوازیں سُن کر میں اپنی آنکھوں کو کچھ راحت دینے کے لیے اور کچھ یہ دیکھنے کے لئے بالکنی میں آ کر کھڑا ہو گیا کہ آخر گلی کے کُتّے اتنی سردی میں بھی اپنے گلے کو لگاتار اتنی زحمت کیوں دے رہے ہیں!

بہر حال، میری نگاہیں اُس گلی کا جائزہ لینے لگیں جہاں ایک شناسا کے گھر کے روشن دانوں سے روشنی چھن چھن کر گلی کی تاریکی کو چیر رہی تھی اور کتّوں کی بھوں بھوں سے زندگی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ دھت.....دھت.....اَبے چُپ! کیا تم لوگ مجھے جانتے نہیں؟ میں تم سب کا دوست، مسٹر راجیش ہوں۔ سبھی کُتّے ایک لمحہ کے لیے ایسے خاموش ہو گئے جیسے وہ سب مسٹر راجیش کے تابعدار ہوں۔ اسی اثناء میں، دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ ساتھ ایک نسوانی آواز سنائی دی: آپ آ گئے۔ آج بھی بہت دیر کر دی۔

ہاں، میں آ گیا۔ دروازہ بند کرو اور جلدی سے مجھے کھانا گرم کر کے دو۔ بہت بھوک لگی ہے۔ یہ بطور شوہر، مسٹر راجیش کا حکم تھا۔ مجھے کیا، گلی کے سب ہی لوگوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ جب راجیش رات گئے نشے کی حالت میں لوٹتا ہے تو پورا گھر کچھ دیر کے لیے جہنم بن جاتا ہے۔ بیوی، جسے وہ بہت چاہتا ہے، وہ اپنے شوہر کو رحم طلب نگاہوں سے دیکھتی اور اس کا جسم مارے خوف کے تھرتھرانے لگتا ہے کیونکہ کو راجیش نشے کی حالت میں ذرا ذرا سی بات پر بے قابو ہو جاتا اور اپنی بیوی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ کر اول فول بکتا۔ فحش گالیاں دیتا۔ اُس کی چوٹی پکڑ کر فرش پر گھسیٹتا اور پھر پیٹنے لگتا۔

اس خوف زدہ ماحول میں، اس کی دو چھوٹی چھوٹی معصوم بیٹیاں چیخ کر جاگ اٹھتیں۔ فریاد کرتیں، ہاتھ جوڑتیں، گڑگڑاتیں، مگر وہ؟ وہ کسی کی نہیں سنتا! البتہ جب وہ چیختے، چلاّتے، مارتے اور گالیاں بکتے بکتے تھک جاتا تو اپنے کمرہ کے ایک کونے میں نڈھال ہو کر کہیں پڑ جاتا اور اس کی بچیاں رات بھر خوف کے مارے نہ روتیں اور نہ سوتیں۔ اس کی بیوی بھی پوری رات اپنی قسمت کو کوستی رہتی مگر راجیش ساری رات دنیا سے بے خبر خراٹے بھر رہا ہوتا۔ اس رات بھی سب کچھ ایسا ہی ہوا۔ راجیش کمار ایک سرکاری دفتر میں اکاونٹنٹ کلرک تھا۔ پھر وہ ترقی پا کر اکاؤنٹینٹ بن گیا۔ ملازمت کی ابتدا کے دوران سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ وہ ٹھیک آفس ٹائم کے بعد سیدھے گھر آ جاتا تھا لیکن جلد ہی لوگوں نے اپنا کام کروانے کے لیے اسے تحفے دینے شروع کر دیے۔ بہت جلد ان تحفوں نے رشوت کی شکل اختیار کر لی۔ اب وہ آفس ٹائم کے بعد بھی دفتر میں بیٹھنے لگا اور جن نامی شراب کی چسکی لینے لگا۔ دھیرے دھیرے اسے اسکی ایسی لت لگی کہ اب وہ روزانہ مختلف برانڈ کی شراب کا مزہ لینے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ آفس کے ساتھیوں کے ساتھ تاش کھیلنے لگا۔ پھر اس کھیل نے قمار بازی کا روپ اختیار کر لیا۔ اب اسے جوا بہت اچھا لگنے لگا۔ اس شغل میں اسکا کافی وقت دفتر اور نئے دوستوں کے ساتھ گذرنے لگا۔ اب وہ اکثر و بیشتر کافی رات کو گھر آتا اور پھر وہ گھر اس کی بیوی اور بیٹیوں کے لیے جہنم بن جاتا۔ لہٰذا میں نے طے کیا کہ میں اسے سمجھاؤنگا، کہ وہ نشے اور قمار بازی سے توبہ کرے اور اپنی بیوی اور معصوم بیٹیوں کی زندگی جہنم نہ بنائے۔ اِس ارادہ کے ساتھ جب میں دوسرے دن صبح اُس کے گھر پہنچا اور دروازہ کی گھنٹی بجائی تو اندر سے آواز آئی۔ کون صاحب ہیں؟ میں ہوں، رئیس، رئیس صدیقی۔ آئیے، آئیے، تشریف لائیے۔ بڑی خوشگوار آواز میں جواب ملا۔ جب میں گھر کے اندر داخل ہوا تو میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی راجیش ہے جس کے قدم رات کو بہک جاتے ہیں۔ یہ وہی دونوں کم عمر بیٹیاں ہیں جو رات کو اپنے باپ کے سامنے رو رو کر گڑگڑا رہی تھیں۔

مگر اس وقت وہ دونوں اپنے باپ کے ساتھ کھیلنے میں مست تھیں، خوش تھیں، چہرے پر مسرت چھائی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی بیوی چائے لے کر آ گئی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں مگر وہ اپنی دونوں بیٹوں کو خوش دیکھ کر بہت خوش تھی۔ یہ خوشگوار ماحول دیکھ کر میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میں نے چائے پی اور یہ کہتے ہوئے اجازت لی کہ ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے، پھر کبھی آؤں گا۔ آج ایک ماہ کے سرکاری دورہ کے بعد جب میں ایک افسانہ لکھنے کے لیے گھر کی دوسری منزل پر بنے اپنے اسٹڈی روم میں بیٹھا تو میرے قلم ندارت تھے۔ دراصل میری بیٹی ثمن کی بہت بڑی کمزوری ہے میرے قلم۔ لہٰذا میں اپنی بیوی سے پین لینے کے لیے زینے سے نیچے اتر ہی رہا تھا کہ غیر شعوری طور پر میری نظر سامنے والی گلی میں آتے ہوئے ایک آدمی پر پڑی۔ اس کے چہرہ پر داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ سر کے بال ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے۔ جسم پر میلے اور بوسیدہ کپڑے تھے۔ اس کی چال سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ شخص رنج و غم کا مارا ہوا ہے۔ وہ بالکل ٹوٹ چکا ہے۔ وہ زندگی سے مایوس ہو چکا ہے۔ وہ اب صرف زندگی کے دن کاٹ رہا ہے۔ جب میں نے اسے غور سے دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ کوئی اور نہیں، وجے تھا۔ میں نے بڑی بے تابی سے اپنی بیوی سے پوچھا، یہ وجے کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا وہ بیمار ہے؟ اس کی بیوی اور بیٹیاں کیسی ہیں؟ میری بیوی نے افسوس جتاتے ہوئے بتایا۔ راجیش کی بیوی اور دونوں بیٹیاں اسے چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ کافی تلاش کیا گیا مگر کچھ پتہ نہیں چلا۔ لیکن وہ لوگ وجے کو چھوڑ کر کہاں اور کیوں چلے گئے؟ بیوی نے اپنی عادت کے مطابق مختصر سا جواب دیا۔ کہاں چلے گئے؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ لیکن کیوں چلے گئے؟ اس کا جواب تم خود بھی جانتے ہو۔ یہ کہتے ہوئے وہ غم زدہ لہجہ میں بولی: ہر رات وجے کے بہکے قدموں نے رشتوں کو ایسی اذیت دی کہ ان کے باہمی رشتے سسکنے لگے۔ جب اسکی بیوی روز روز کی چک چک سے تنگ آ گئی تو ایک دن اسکے ضبط اور صبر کے باندھ ٹوٹ گئے اور وہ اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ کہیں گم ہو گئی، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے!

❑❑❑

شبیہہ عباس
گلزار کالونی۔ چنہٹ، لکھنؤ
7054208745

تبصرہ

بارش کے پھول

"بارش کے پھول" کاظم جرولی صاحب کا شعری مجموعہ ہے جو 2023 میں منظرِ عام پر آیا۔ کتاب کے سرورق اور اندرونی صفحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ لکھنؤ کی تہذیبی خوشبو اور جدید ادبی شعور کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ پروفیسر سید محمود الحسن نے شاعر کے بارے میں درست لکھا ہے کہ کاظم جرولی نے شاعری کے مختلف اصناف میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے اور ان کی فکر میں ایک خاص قسم کی انفرادیت پائی جاتی ہے۔ فکری و فنی پہلو کتاب کے عنوان "بارش کے پھول" سے ہی ایک تازگی اور لطافت کا احساس ہوتا ہے۔ مجموعے میں شامل اشعار (جیسا کہ متاعِ حرف کے تحت درج ہیں) اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ شاعر کے پاس صرف الفاظ کا ذخیرہ نہیں بلکہ ایک گہرا مشاہدہ بھی ہے۔

جدیدیت اور کلاسیکیت: کیفی اعظمی جیسے بڑے شاعر نے انہیں "جدید فکر کا شاعر" قرار دیا ہے۔ ان کے کلام میں جذبے کا خلوص، احساس کی شدت اور لفظوں کی جادوگری نمایاں ہے۔

موضوعات کا تنوع: فہرستِ مضامین پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے زندگی کے مختلف رنگوں کو سمیٹا ہے۔ "اتنی ہی زندگی ہے عزیز و شباب میں"، "ابھی تک بے زمین و آسماں ہوں"، اور "مفلسی میں بھی یہاں خود کو سنبھالے رکھنا" جیسے عنوانات انسانی زندگی کی جدوجہد، تنہائی، اور سماجی مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔

رباعیات اور نظمیں: مجموعے میں غزلوں کے ساتھ ساتھ رباعیات، قومی نظمیں، اور "انڈور پلانٹس" جیسی جدید نظمیں بھی شامل ہیں، جو شاعر کے وسیع کینوس کو ظاہر کرتی ہیں۔ اسلوبِ بیان کاظم جرولی کی زبان سادہ مگر پر اثر ہے۔ ان کے اشعار میں ایک خاص قسم کی روانی اور موسیقیت ہے۔ "متاعِ حرف" کے اس شعر سے ان کے انداز کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے: وقت ہی بتائے گا اب یہ ماجرا کیا ہے > کیوں مرے تصور میں صرف نقطہ با ہے یہ شعر فکری گہرائی اور تصوف کے پہلوؤں کو بھی چھوتا ہے۔ تکنیکی تفصیلات کتاب کی ظاہری ترتیب بھی متاثر کن ہے۔ 200 صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ نصیر منزل، شاہ گنج لکھنؤ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کتاب کی قیمت 250 روپے رکھی گئی ہے، جو کہ موجودہ دور میں ایک معیاری شعری مجموعے کے لیے نہایت مناسب ہے۔

مجموعی طور پر "بارش کے پھول" اردو ادب کے قارئین کے لیے ایک عمدہ تحفہ ہے۔ کاظم جرولی نے اپنی شاعری کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ روایت سے جڑے رہ کر بھی جدید دور کے تقاضوں اور انسانی نفسیات کو بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے خاص طور پر اہم ہے جو لکھنوی تہذیب کے جدید رنگ اور سنجیدہ شاعری کے مداح ہیں۔ کاظم جرولی صاحب کے مجموعہ کلام "بارش کے پھول" پر اگر سنجیدگی سے نظر ڈالی جائے تو اس کتاب کے ادبی مرتبے اور شاعرانہ بصیرت کے کئی نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ متاعِ حرف: شاعر کا منثور کتاب کے ابتدائی کلام "متاعِ حرف" میں کاظم صاحب نے اپنی شعری کائنات کا ایک مکمل نقشہ پیش کیا ہے۔ ان کے اشعار میں روشنی، چراغ اور سحر کی جستجو بار بار ملتی ہے۔ ان کا یہ مصرعہ: "دور تک فضاؤں میں روشنی کا پہرا ہے" یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ مایوسی کے اندھیروں میں بھی امید کا دامن نہیں چھوڑتے۔ ان کی شاعری "جشنِ اجالوں" اور "خوف کے اندھیروں" کے درمیان ایک ایسی توازن کی راہ نکالتی ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ فنی تنوع اور ستعفہر ستِ مضامین کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کاظم جرولی نے خود کو کسی ایک محدود دائرے میں قید نہیں رکھا۔ غزلیہ آہنگ: ان کی غزلوں میں کلاسیکی لکھنوی رچاؤ کے ساتھ ساتھ جدید حسیت بھی موجود ہے۔ جدید نظمیں: "انڈور پلانٹس"، "شکستِ احساس" اور "تیلی جھمبیل" جیسے عنوانات بتاتے ہیں کہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول اور بدلتی ہوئی سماجی قدروں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ □□□

کوائف

نامِ کتاب	:	بارش کے پھول
شاعر	:	کاظم جرولی
مبصر	:	شبیہہ عباس
ضخامت	:	200 صفحات
قیمت	:	-/250 روپئے
ناشر	:	کاظم جرولی

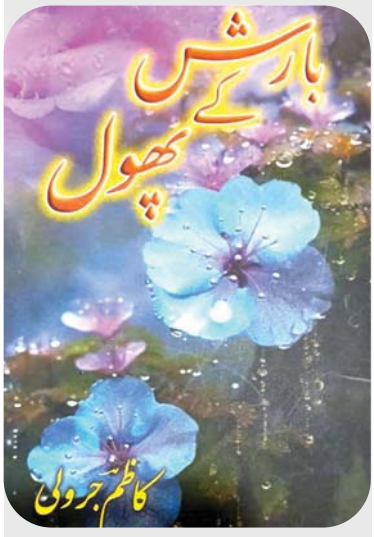

شاہد عباس
مفتی گنج، چوک لکھنؤ
9839346181

ترقیات

اتر پردیش میں سردی سے تحفظ: شیلٹر ہومز اور حکومتی اقدامات

اتر پردیش میں موسم سرما اپنی شدت کے لیے جانا جاتا ہے۔ جب درجہ حرارت تیزی سے گرتا ہے اور سرد لہر (ColdWave) چلتی ہے، تو معاشرے کے غریب اور بے گھر افراد کے لیے بقا کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے میں اتر پردیش حکومت کی جانب سے شہروں اور قصبوں میں قائم کیے گئے شیلٹر ہومز یا رین بسیرا ان لوگوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہوتے۔ شیلٹر ہومز کا مقصد اور قیام حکومت کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ریاست میں کوئی بھی شخص کھلے آسمان کے نیچے سونے پر مجبور نہ ہو اور سردی کی وجہ سے کسی جانی نقصان کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس مقصد کے لیے: ریلوے اسٹیشنوں، بس اڈوں اور ہسپتالوں کے قریب عارضی اور مستقل شیلٹر ہومز بنائے جاتے ہیں۔

میونسپل کارپوریشنوں (نٹرنگم) کو خصوصی ہدایات دی جاتی ہیں کہ وہ سڑکوں پر سونے والے افراد کو ان پناہ گاہوں تک منتقل کریں۔ فراہم کردہ سہولیا تاتر پردیش حکومت نے ان شیلٹر ہومز کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے کئی اقدامات کیے ہیں۔ وہاں مقیم افراد کو درج ذیل سہولیات فراہم کی جاتی ہیں: بستر اور کمبل: سردی سے بچنے کے لیے صاف ستھرے گدے، تکیے اور گرم کمبلوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ صفائی ستھرائی: پینے کے صاف پانی اور بیت الخلا کی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ گرمی کا انتظام: کئی مقامات پر الاؤ (آگ جلانا) اور ہیٹرز کا بھی انتظام کیا جاتا ہے تاکہ کمروں کا درجہ حرارت متوازن رہے۔ حفاظت: خواتین اور مردوں کے لیے الگ الگ ٹھہرنے کے انتظامات کیے جاتے ہیں تاکہ سیکورٹی اور راز داری برقرار رہے۔ نگرانی اور انتظام حکومت نے ان پناہ گاہوں کی نگرانی کے لیے سخت نظام وضع کیا ہے۔ ضلعی مجسٹریٹ (DM) اور دیگر اعلیٰ حکام کو پابند کیا جاتا ہے کہ وہ رات کے وقت ان مقامات کا اچانک معائنہ کریں تاکہ انتظامیہ کی غفلت کا سدباب ہو سکے۔

سوشل میڈیا اور ہیلپ لائن نمبرز کے ذریعے بھی عوام سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ کسی بھی ضرورت مند کو دیکھ کر قریبی شیلٹر ہوم پہنچانے میں مدد کریں۔ سماجی اثرات ان شیلٹر ہومز کی تعمیر سے نہ صرف اموات کی شرح میں کمی آئی ہے بلکہ سماج کے پسماندہ طبقات میں یہ احساس بھی پیدا ہوا ہے کہ ریاست ان کی دیکھ بھال کے لیے کوشاں ہے۔ یہ اقدامات انسانی حقوق کی پاسداری اور ایک فلاحی ریاست کے تصور کو تقویت دیتے ہیں۔

اختتام: اتر پردیش حکومت کی جانب سے سردی کے موسم میں شیلٹر ہومز کا قیام ایک قابل ستائش عمل ہے۔ تاہم، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان پناہ گاہوں کی تعداد میں مزید اضافہ کیا جائے اور وہاں دی جانے والی سہولیات کی معیار کو مسلسل برقرار رکھا جائے تاکہ معاشرے کا ہر

کمزور فرد سردی کی اس شدت میں خود کو محفوظ محسوس کر سکے۔

اتر پردیش حکومت نے حالیہ برسوں میں شیلٹر ہومز (رین بسیروں) کے نظام کو مزید منظم بنانے کے لیے کئی نئی جہتیں شامل کی ہیں: ڈیجیٹل مانیٹرنگ اور جیوٹیگنگ: حکومت اب گوگل میپس اور مخصوص موبائل ایپس کا استعمال کر رہی ہے تاکہ عام شہری اپنے قریبی شیلٹر ہوم کا مقام آسانی سے تلاش کر سکیں۔ تمام سرکاری رین بسیروں کی جیوٹیگنگ کی گئی ہے تاکہ ان کی لوکیشن اور وہاں دستیاب بستروں کی تعداد کا ڈیٹا آن لائن دستیاب رہے۔ طبی امداد کا مربوط نظام: صرف چھت فراہم کرنا ہی کافی نہیں ہوتا، شدید سردی میں بے گھر افراد کو بیماریوں کا خطرہ بھی رہتا ہے۔ اس کے پیش نظر: قریبی سرکاری ہسپتالوں کے ڈاکٹروں کی ٹیمیں وقتاً فوقتاً ان شیلٹر ہومز کا دورہ کرتی ہیں۔ ہنگامی صورتحال کے لیے ایمبولینس سروس (108) کو ان مراکز کے ساتھ ہائی الرٹ پر رکھا جاتا ہے۔

خصوصی موبائل یونٹس: کچھ بڑے شہروں جیسے لکھنؤ، کانپور، اور وارانسی میں حکومت کی جانب سے 'موبائل شیلٹر ہومز' (بسیوں میں بنے عارضی کمرے) کا تجربہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ ان علاقوں میں بھیجے جاتے ہیں جہاں اچانک لوگوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے یا جہاں مستقل عمارت کی تعمیر ممکن نہیں ہوتی۔ چیلنجز اور ان کا تدارک: حکومت ان مراکز کو چلانے میں پیش آنے والے چیلنجز پر بھی کام کر رہی ہے: آگاہی کی کمی: بہت سے لوگ اب بھی سڑکوں پر سوتے ہیں کیونکہ انہیں شیلٹر ہومز کا علم نہیں ہوتا۔ اس کے لیے پولیس کی پٹرولنگ ٹیمیں رات کے وقت سڑکوں پر نکلتی ہیں اور لوگوں کو زبردستی یا پیار سے رین بسیروں میں منتقل کرتی ہیں۔ کھانے کا انتظام: اگرچہ شیلٹر ہوم بنیادی طور پر رہنے کے لیے ہیں۔

❑❑❑

عزتمآب گورنر آنندی بین پٹیل، جناب وزیر اعلیٰ اتر پردیش یوگی آدتیہ ناتھ اسمبلی سیشن کے افتتاحی اجلاس میں جاتے ہوئے۔

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جاپان کے یاماناشی پریفیکچر کے ایک اعلیٰ سطحی وفد سے ملاقات کرتے ہوئے۔

वर्ष : 79 अंक 11
मार्च, 2025
मूल्य : 15 रु./–
वार्षिक मूल्य : 180 रु./–

उर्दू मासिक, **नया दौर**
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. स्वत्वाधिकारी के लिए **विशाल सिंह**, निदेशक, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. लखनऊ द्वारा प्रकाशित तथा प्रकाश एन. भार्गव, प्रकाश पैकेजर्स, प्रथम तल, शगुन पैलेस, 3–सप्रू मार्ग, लखनऊ द्वारा मुद्रित, सम्पादक– **आशिया ख़ातून**